(ٹیپو سلطان کے ایک نادر ذخیرۂ مخطوطات کا اشتہار صفحہ ۵۲ پر ملاحظہ ہو)

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جس طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپکا چندہ جون میں ختم ہوگیا اور جولائی کا پرچہ نو روپیہ میں وی پی روانہ ہوگا

جلد ۷۷	فہرست مضامین جون ۱۹۵۸ء	شمار ۶

خطات ---------- ۴

یم چاند پوری ---------- سعید بی، اے (علیگ) ---------- ۶

سفہ کا تصور الٰہ ---------- (نواب) محمد عباس طالب صفوی ---------- ۲۰

ومن کا تغزل ---------- ڈاکٹر عبادت بریلوی ---------- ۳۲

جب آتش جواں تھا ---------- نیاز فتحپوری ---------- ۳۶

جمال الدین افغانی کا ایک خطبہ ---------- ۴۳

ایک فلسفی کا انجام ---------- نیاز فتحپوری ---------- ۴۷

مولانا ابوالکلام کی ایک پیش گوئی ---------- ۵۰

نادرات ---------- ۵۲

نظومات ---- ندیم جعفری - ارشد کاکوی - حفیظ نعیمی - ساحر بھوپالی - شفقت - اکرم دھولیوی - صبا جائسی ---- ۵۳

ہندوستان و پاکستان کے خریداران نگار سے

نگار کا سالانہ چندہ اب نو روپیہ ہے اور اگر وہ سالنامہ ذریعہ رجسٹری حاصل کرنا چاہتے ہیں تو منی آرڈر نو روپیہ آٹھ آنے کا روانہ فرمائیں۔
نگار کی تاریخ اشاعت ہر ماہ کی ۱۰ مقرر ہے اگر ۱۲ تک کسی کو پرچہ نہ پہونچے گا تو ہم دوبارہ بیرنگ بھیج دیں گے۔
(پاکستان بیرنگ نہیں بھیج سکتے)
پاکستان چونکہ وی، پی نہیں جا سکتا اس لئے ہم کو مجبوراً پرچہ روک لینا پڑتا ہے جب تک ان کا چندہ وصول نہ ہو جائے۔
خریدارانِ پاکستان اپنا چندہ نو روپئے آٹھ آنے ذیل کے پتہ پر ذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر رسید ڈاک خانہ براہ راست ہم کو لکھنؤ کے پتہ پر بھیجدیں۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۱۰۵ - گارڈن ویسٹ - کراچی

خط و کتابت میں ہر خریدار کو اپنا نمبر خریداری ضرور لکھنا چاہئے، جو ہر مہینے پتہ کی چٹ پر بائیں طرف درج ہوتا ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

دونوں ہیں تو ہمسائے...
مگر ایک دُوسرے سے پُشتوں دُور!

جی ہاں، دونوں آپس میں ہمسائے ہیں، دیکھئے — ایک سا لباس، ایک سی بُود و باش، مگر یہ نہ سمجھ لیجئے کہ دونوں ہر پہلو سے ایک سے ہیں۔ اِنکی اپنی اپنی انفرادیت ہے۔ اور کئی بار تو ہمسائوں کے ذہن، سوچ اور خیالات میں پُشتوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔

انسانی طبع کی یکرنگی و نیرنگی کا مطالعہ نہایت دلچسپ مشغلہ ہے۔ ہندوستان لیور میں ہم 'مارکیٹنگ ریسرچ' کے جدید علم کے ذریعے ہندوستان کے ہر حصّے کے باشندوں اور ان کے ہمسائوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ انکی مانگیں، اُمنگیں، پسند، ناپسند — ہمیں ان سب سے دلچسپی ہے۔ ان سے ہمیں آپ کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں، آپکی ضروریات سے واقفیت پہنچتی ہے جس کے مطابق ہم آپکی پسند کے مصنوعات تیار کر سکتے ہیں جو آپکے مذاق پہ پورے اُتریں اور آپکے طرزِ زندگی میں آسائش بہم پہنچائیں۔

سینکڑوں ملاقاتیں... ہزاروں سوال جواب... اعداد و شمار — انہیں اکھٹا کر کے ان کی چھان بین کے بعد ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ — ان مرحلوں سے گذر کر ہمیں آپ کی ضرورتوں کی صحیح تصویر حاصل ہوتی ہے۔

اور یوں 'مارکیٹنگ ریسرچ' کے ذریعے آپ اپنے مشوروں سے ہماری رہنمائی کرتے رہتے ہیں — کیونکہ یہ مصنوعات ہم آخر آپ ہی کے لئے تو تیار کرتے ہیں۔

ہندوستان لیور کا آدرش — گھر گھر کی خدمت

میٹرک نظام کا آغاز

اس وقت بھارت میں ناپ تول کے پیمانوں کا کوئی مشترک نظام نہیں ہے۔ یہاں تقریباً ۱۴۳ قسم کے مختلف نظام رائج ہیں۔ اتنے نظاموں کی وجہ سے بددیانتی کی گنجائش رہتی ہے۔ میٹرک ناپ تول کے پیمانوں کی بنا پر جو مشترک نظام سارے ملک میں لاگو کیا جا رہا ہے۔ اس سے لین دین اور حساب کتاب میں بڑی سہولت ہو جائے گی۔ عام طور پر اس لئے کہ اب ہم عشری سکوں کو بھی اپنا چکے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں جو ناپ تول ایکٹ بنایا گیا، اس کے مطابق ناپ تول کے بنیادی یونٹ میٹرک نظام کی بنا پر مقرر کئے گئے یہ تبدیلی رفتہ رفتہ کی جائے گی تاکہ عوام کو کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

کسی علاقے یا بیوپار میں میٹرک نظام لاگو ہو جانے کے بعد بھی تین سال تک پرانے ناپ تول استعمال کئے جاتے رہیں گے۔

ناپ تول کا میٹرک نظام
اکتوبر ۱۹۵۸ء سے شروع ہو رہا ہے

تول کا یونٹ کیلوگرام ہے۔
کیلوگرام = ۱ سیر ۶ تولے ۱ ماشہ ۸۶ رتی
یا ۲ پونڈ ۳ اونس

میٹرک نظام
کی
جاں کاری
حاصل کیجئے

چھوٹے یونٹ

۱۰ ملی گرام	=	۱ سنٹی گرام
۱۰ سنٹی گرام	=	۱ ڈسی گرام
۱۰ ڈسی گرام	=	۱ گرام
۱۰ گرام	=	۱ ڈیکا گرام
۱۰ ڈیکا گرام	=	۱ ہیکٹو گرام
۱۰ ہیکٹو گرام	=	۱ کیلو گرام

بڑے یونٹ

۱۰۰ کیلو گرام	=	۱ کوئنٹل
۱۰ کوئنٹل	=	۱ میٹرک ٹن
۱۰۰۰ کیلو گرام	=	۱ میٹرک ٹن

۱

ملاحظات

پاکستان کا ایک فتنۂ عظیم

اس وقت، پاکستان جیسا کہ خود وہاں کے رسایل و جراید سے معلوم ہوتا ہے بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے اور معاشی و اقتصادی حیثیت سے وہ اس نقطہ تک پہونچ گیا ہے کہ اگر عوام کے جذبات ناقابل ضبط ہو جائیں اور ملک میں کوئی "انفجاری" کیفیت پیدا ہو جائے تو تعجب نہ کرنا چاہئے۔ لیکن اس وقت ہمارا روئے سخن اس سے بھی زیادہ ایک اور خطرۂ عظیم کی طرف ہے کہ اگر حکومت پاکستان نے کوئی فوری تدارک اسکا نہ کیا اور جو آتش فشاں پہاڑ وہاں اندر ہی اندر سلگ رہا ہے اگر اس کو جلد ٹھنڈا نہ کیا گیا تو ہم اس تباہی اور قتل و خونریزی کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے جس سے نہ صرف سرزمینِ پاک رنگی جانے والی ہے بلکہ ممکن ہے اس کے اثرات بھارت تک پہونچ جائیں۔

یہ خطرہ نہ پاکستان کی بیرونی سیاست سے تعلق رکھتا ہے، نہ اندرونی سیاست سے بلکہ صرف اہلِ پاکستان کے مذہبی جذبات سے۔ سرزمین پنجاب ہمیشہ سے مذہبی اختلافات کا مرکز رہی ہے، لیکن ان اختلافات کا تعلق کفر و اسلام سے اتنا نہیں رہا جتنا خود مسلمانوں کی باہمی اجتماعی تفریق سے اور جس کی تازہ ترین مثال وہ فتنہ ہے جو اب سے دو سال قبل "احمدی جماعت" کی تکفیر کے سلسلہ میں سامنے آیا اور خدا جانے کتنے انسانوں کی جان لے کر ختم ہوا۔ پھر یہ احمدی و غیر احمدی اختلاف ختم تو کیا ہوتا، یوں کہئے کہ عارضی طور پر دب گیا اور وہاں کی اکثریت اس سے مطمئن ہو گئی۔ لیکن اس وقت میں جس فتنۂ عظیم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ شیعی سنّی اختلاف ہے جو وہاں روز بروز نہایت خطرناک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے اور اگر بدقسمتی سے یہ آگ وہاں بھوٹ پڑی تو پھر اس کی تباہکاریوں کا کوئی علاج ممکن نہ ہوگا۔

تقسیم ہند سے پہلے بھی پنجاب اور دوسرے مقامات میں شیعوں کی ایک مقتدر جماعت موجود تھی، لیکن شیعی سنّی جذبات میں کوئی ایسی تلخی نہ پائی جاتی تھی جو دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دے یا مذہبی عقاید کی بنا پر تلواریں کھنچ جائیں۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد جب ہندوستان کے بہت سے مقتدر شیعی خاندان پاکستان پہونچے تو ان میں بعض ایسے بھی تھے جو بدقسمتی سے پاکستان کو صحیح معنی میں "دارالسلام" بنانے کا ولولہ بھی اپنے ساتھ لے گئے جو برطانوی عہد یا کفرستان بھارت میں پورا نہ ہو سکتا تھا چونکہ بھارت سے پاکستان منتقل ہونے والے شیعی افراد اکثر و بیشتر علم و اقتدار کے لحاظ سے بہت اونچا درجہ رکھتے تھے اس لئے انھیں حکومت میں بہ آسانی درخور حاصل ہو گیا اور وہ اچھے اچھے عہدوں پر ممتاز ہو گئے اور اس سے وہاں کی غالی شیعہ آبادی کو زیادہ کھل کر اظہار خیال کا موقع مل گیا۔ جس کے سننے کے وہاں کی سنّی آبادی عادی نہ تھی اور باہمی تعلقات میں کشمکش شروع ہو گئی۔ اس دوران میں یہ اختلاف آہستہ آہستہ زیادہ سنگین صورت اختیار کرتا رہا اور جا بجا وہاں دونوں جماعتوں میں باہمی تصادم کے واقعات بھی سننے میں آئے۔ یہ تو ہے اس کشمکش کی ظاہری صورت لیکن اندرونی طور پر یہ معاملہ نہایت سخت خطرہ کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت یہ آتش فشاں پہاڑ وہاں پھوٹ پڑے اور پاکستان کو ایک رزمگاہ خونیں میں تبدیل کر دے۔ دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ مناظرہ، مجادلہ و مکابرہ کی طیاریاں کر رہی ہیں اور اگر خدانخواستہ یہ تلخی اسی طرح بڑھتی رہی تو یقیناً وہ صرف "کام و دہن" تک محدود نہ رہے گی، بلکہ ایک عام فرقہ وارانہ جنگ و جدل میں تبدیل ہو جائے گی اور ہزاروں انسانوں کا خون بہانے کے بعد بھی یہ فتنہ فرو نہ ہو سکے گا۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت وہاں کے پریسیڈنٹ، پنجاب کے چیف منسٹر، پولیس اور سول کے متعدد بڑے بڑے عہدہ دار شیعی ہی ہیں (اور ہو سکتا ہے کہ اسی اعتماد نے وہاں کی شیعی جماعت کی ہمت افزائی کی ہو) لیکن چونکہ عوام کی اکثریت سنّی ہے اس لئے میں سمجھتا

ہوں کہ اس باب میں شیعی حضرات کو بہت سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا چاہئے، کیونکہ مذہبی اشتعال بڑی نامعقول چیز ہے اور جب یہ حد سے گزر جاتا ہے تو پھر "نادر و نادری" اور "دارائی و اسکندری" بھی خاک میں مل جاتی ہیں۔ ممکن ہے وہاں کی حکومت کو ان حالات کا احساس ہو، لیکن پاکستانی حکومت کا خواب غفلت کوئی نئی چیز نہیں اس لئے اس سے کوئی توقع رکھنا بیکار ہے، البتہ حیرت ہے وہاں کے اخبارات پر جنھوں نے اب تک اس مسئلہ کو قابل توجہ قرار نہیں دیا اور اس فتنہ کا سدِباب کرنے کے لئے انھوں نے اب تک کوئی موثر قدم نہیں اُٹھایا۔

مولانا آزاد کے خودنوشت سوانح

مولانا آزاد کی وفات کے بعد یہ خبر سننے میں آئی کہ مولانا آزاد نے اپنے سوانح حیات کے متعلق یہ وصیت کی ہے کہ وہ فروری ۱۹۸۸ء سے قبل شایع نہ کئے جائیں اور اس سلسلہ میں بعض حلقوں کی طرف سے اس کا سبب یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ مولانا نے بعض اہم معاصر شخصیتوں پر بھی نکتہ چینی کی تھی چونکہ مولانا یہ پسند نہ کرتے تھے کہ ان کے معاصرین کے احساسات کو ان کے جیتے جی کوئی صدمہ پہونچے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ قیاس کس حد تک درست ہے، اس کا صحیح علم ہمایوں کبیر صاحب ہی کو ہو سکتا ہے جنھوں نے اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اور ان کی طرف سے کوئی واضح بیان اس وقت تک شایع نہیں ہوا۔ لیکن کہا یہی جاتا ہے کہ مولانا نے ایسی وصیت کی تھی اور موجودہ نسل اس کے استفادہ سے مایوس ہو چکی تھی۔ تاہم اس کے بعد ہی مولانا ملیح آبادی نے "مولانا آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی" شایع کردی جسے خود مولانا آزاد نے جیل کے اندر املا کرایا تھا اور جس میں انھوں نے اپنے دور تشکیل کا بھی ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد قدرتاً یہ سوال سامنے آیا کہ آیا اس صورت میں "سربند سوانح" کی اشاعت کا التزام حسب وصیت مولانا آزاد ۱۹۸۸ء تک مناسب ہوگا یا نہیں اور جیسا کہ اخبارات سے معلوم ہوتا ہے "ساہتیہ اکاڈیمی" نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کی اشاعت میں کوئی مضایقہ نہیں اگر ان حصوں کو حذف کر دیا جائے جن کے پیشِ نظر کتاب کی اشاعت کو ۱۹۸۸ء تک ملتوی کر دیا گیا تھا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں اس وقت تک جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے، غلط ہے، اگر مولانا کی وصیت کا واقعہ صحیح ہے تو پھر نہ مولانا ملیح آبادی کو اپنی کتاب شایع کرنا چاہئے تھی اور نہ ساہتیہ اکاڈیمی کو یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ کتاب کے بعض اجزاء حذف کر کے اسے شایع کیا جائے۔

اگر مولانا ملیح آبادی کے شایع کردہ سوانح میں ذکر تشکیک کا بھی ہے تو یہ کوئی بُری بات نہیں کیونکہ ہر بڑا مفکر اس دور سے گزرتا ہے اور مجھے خود ذاتی طور پر ان کے اس دور کا علم ہے۔ اسی طرح اگر "سربند حیات" میں عہدِ حاضر کے بعض اکابر پر ناقدانہ اظہارِ خیال کیا گیا ہے تو اس کی اشاعت کا وقت یہی ہے نہ کہ اب سے تیس سال بعد جب ان میں کوئی زندہ موجود نہ ہوگا، اور مولانا کا لکھا ہوا "حرفِ پارینہ" ہو کر رہ جائے گا۔ بہرحال اس وقت ساہتیہ اکاڈیمی کے سامنے دو پہلو ہیں ایک اخلاقی، دوسرا افادی، اگر اخلاقی پہلو کی رعایت مدِنظر ہے تو اس کتاب کا کوئی حصہ ۱۹۸۸ء تک شایع نہ ہونا چاہئے اور اگر افادی پہلو قابلِ ترجیح ہے (اور یقیناً ہے) تو اس کو تمام و کمال بغیر کوئی حصہ حذف کئے ہوئے سامنے آنا چاہئے۔

چند ضروری اعلانات

(۱) اپنی ناسازی مزاج اور گرمی کی شدت کی وجہ سے ممکن ہے کچھ دنوں کے لئے مجھے نینی تال جانا پڑے، اور ہو سکتا ہے کہ جولائی کا نگار ہفتہ عشرہ کی تاخیر سے شایع ہو، لیکن ابھی تک یہ امر متیقن نہیں ہے۔ تاہم اگر ایسا ہوا بھی تو دفتر کا کام بدستور جاری رہے گا اور احباب کے خطوط مجھ تک پہونچتے رہیں گے ـــــ (۲) آیندہ سال نامہ کیا ہوگا، ابھی تک میں کچھ طے نہیں کر سکا۔ ہمارے عزیز دوست پروفیسر مجنوں نے "ایران و ایرانیات" کا موضوع تجویز کیا ہے، لیکن اس پر کام کرنے کے لئے بڑا وقت چاہئے اور امید نہیں کہ چھ ماہ کی قلیل مدت میں یہ کام پورا ہو سکے گا، تاہم میں کوشش ضرور کروں گا بشرطیکہ میری صحت نے میرا ساتھ دیا ـــــ (۳) جناب اثر لکھنوی کی غزل کے سلسلہ میں جو اسنادی بحث نگار میں جاری تھی اس پر ایک ثالثی محاکمہ مولانا عرشی رامپوری کا آیندہ اشاعت میں ملاحظہ سے گزریگا۔ نیاز

قائم چاندپوری

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

سعیدی بی، اے (علیگ)

انسان کی زندگی عارضی ہے اور "کل نفس ذائقۃ الموت" کے اصول کے تحت سب فانی ہیں، لیکن نادان انسان اس سے غافل ہو کر اپنی اس دو روزہ زندگی میں بڑے بڑے منصوبے سوچتا ہے اور وسیع و پختہ و سنگین عمارات بنواتا ہے، وہ نہیں جانتا کہ ابھی اسکی آرزو بھی پوری نہیں ہونے پاتی کہ پیغام اجل آپہونچتا ہے ہم تو کس شمار و قطار میں ہیں۔ بڑے بڑے بادشاہانِ عالیجاہ مثل جمشید و فریدوں کے بنائے ہوئے قصرہائے فلک دوز آج سونے پڑے ہوئے ہیں، در و دیوار شکستہ ہو چکے ہیں اور زبانِ حال سے درس عبرت دے رہے ہیں ؎

بنا دے کوئی عمارت سو کس توقع پر　　پڑا ہے قصر فریدوں بن آدمی سونا

نامراد عاشق کا محبوبۂ دلنواز کے زلف گرہ گیر کا اسیر ہونا اصول عشق سے مانا گیا ہے، دیکھئے اس زلف شبگوں جیسے پامال مضمون کو قائم نے کس شان سے باندھا ہے ؎

دل پا کے اس کی زلف میں آرام رہ گیا　　جس جا ہوئی غریب کے تئیں شام رہ گیا

قیس و فرہاد، مجنوں و وامق۔ بہت سے عاشق دنیا سے نامراد اٹھے جس کسی نے اس کوچہ میں قدم رکھا وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اس کا سینہ حسرت و یاس کا مدفن بنا، آرزو و تمنا دل میں لئے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوا، یہ بیحد پرخار وادی ہے جس کسی نے اسکی طرف رُخ کیا اپنے دامن کی دھجیاں بنالیں، محبت وہ بُری بلا ہے کہ جان ہی لے کر چھوڑتی ہے، عشق کا کوچہ مردم کشی میں بہت بدنام ہے، جوانی دیوانی و رعنا اور بہکا کر اس کوچہ کی طرف لیجاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیست کی امید باقی نہیں رہتی ہے، شاعر نے اسی امر کو واضح کیا ہے ؎

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری　　مر چکے ہیں اسی آزار میں بیمار بہت

زندگی میں کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور ہونا چاہئے، ایک وارفتہ کے لئے تو اوقات گزاری کے لئے شغل کی اس سے زیادہ ضرورت لاحق ہوتی ہے، تازہ تازہ جب محبت کا آزار تھا اس وقت آنکھوں سے ندیاں بہا کرتی تھیں لیکن اب یہ خشک ہو چکی ہیں، اس لئے شاعر کہتا ہے ؎

بے شغل نہ زندگی بسر کر　　گر اشک نہیں تو آہ سرکر

ان لیڈیز بے وفاؤں کی حالت کس عمدہ پیرایہ میں بیان کی ہے جو مال و زر کے گرویدہ ہیں انھیں محبت اور کسی کے خلوص سے کوئی غرض نہیں ہے ؎

اے دل بہ رنگ غنچہ نہ گل گلشنوں سے تو　　اپنی گرہ میں اُن کے کھلانے کو زر نہیں

کس قدر پاکیزہ شعر ہے، جذبات کو کس عمدگی سے ظاہر کیا ہے ؎

مجھے اس اپنی مصیبت سے ہے فراغ کہاں　　کسی سے چاہوں کہ صحبت رکھوں دماغ کہاں

ہماری گفتگو میں وہ اثر ہے کہ اچھے اچھے وحشی رام ہو جائیں اور ہمارا کلمہ پڑھنے لگیں، جس کسی نے ہماری باتیں سنیں وہ گرویدہ ہو گیا یوں کہئے کہ تسخیر قلوب کا بہت اچھا نسخہ موجود تھا لیکن ستم تو یہ ہے کہ اس نسخہ کو آزمانے کا کمبخت نے موقع ہی نہیں دیا ہماری طرف مخاطب ہی نہیں ہوا۔

بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ ہماری بات سننا تک گوارا نہیں - ہم کو اپنی شومیِ قسمت ہی سے شکایت ہے ؎

سنگ کو آب کریں پل میں ہماری باتیں　　لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو

یہ بھی طرفہ تماشا ہے کہ ہزاروں عشوہ و انداز سے دل تو لے لیا لیکن اب دل لینے کے بعد تیور ہی بدل گئے، سیدھے منہ بات تک نہیں کی جاتی ہے بلکہ جب بگڑ جاتے ہیں تو نہایت متانت سے کہتے ہیں کہ درِ عدالت کھلا ہوا ہے جاؤ اور فریاد کرو ؎

دل مرا چھین کے کہتا ہے وہ دلبر قایم　　جی جہاں چاہے تمہارا مری فریاد کرو

دل چھیننے اور اپنے عشاق کے دایرہ کو وسیع کرنے کی خواہش فطری طور پر محبوبوں میں موجود ہوتی ہے، اُن کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ جدھر کوئی ان کے رُخ زیبا کی طرف نظر کرے اُن کی نگاہ ناز کا گھایل ہو جائے، اُن کو اس میں بڑا مزہ آتا ہے کہ عشاق کے ساتھ اپنی تفریح طبع کے لئے چھیڑ چھاڑ جاری رہے، جب دیکھتی ہیں کہ کوئی حسن سے متاثر نہیں ہوتا تو ناز و ادا، عشوہ و کرشمہ اور کبھی عجز و نیاز اور کبھی خنجر و ابرو اور تیرِ نظر سے کام لیتی ہیں، غرض مختلف حربوں سے آراستہ رہتی ہیں جو ایک حربہ سے کام نہ چلے تو دوسرے حربہ سے کام لیا جائے ؎

ناز و ادا کہیں کہیں عجز و نیاز ہے　　کس کس طرح سے یار میرا جلوہ ساز ہے

عاشق کی زندگی رنج و غم سے بھری ہوئی ہے، درد و الم اور حزن و ملال کا ساتھ ہے، کشتی حیات تلاطم میں ہے، ہر وقت خطرہ کا خدشہ لگا ہوا ہے، صبح ہوتی ہے تو ایک تازہ مصیبت پیش آتی ہے اور شام ہوتی ہے تو ایک نئی آفت کا سامنا ہوتا ہے ؎

شام ہوتی نہیں اک دل پہ بلا آتی ہے　　صبح ہوتی نہیں اک جی پہ غضب آتا ہے

وادیِ اُلفت کا ایک تجربہ کار سیاح اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر نو گرفتارانِ بلا کو یوں نصیحت کرتا ہے ؎

مر جایئے کسی سے پر اُلفت نہ کیجئے　　جی دیجئے تو دیجئے پر دل نہ دیجئے

ملاحظہ ہو کس بے ساختہ پن کے ساتھ شکایت کی ہے، زبان کی سلاست، طرزِ بیان کی خوبی قابلِ داد ہے شعر کیا ہے جذباتِ دلی کا مظہر ہے ؎

گو ہم سے تم ملے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے　　کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

دل وقفِ یاس و حرماں ہو چکا ہے، اور طبیعت رنج و غم سہتے سہتے مردہ ہو گئی ہے، عیش و عشرت کی ہوس ہے اور نہ محفلِ نشاط کی خواہش باقی ہے ؎

کسے گلگشت گلشن کی ہوس ہے　　اسیری کا جگر پر داغ بس ہے

ناحق لوگوں نے گلشن کا تذکرہ چھیڑ دیا، بیچارا عاشق تو اسی حالتِ قفس میں مست تھا ؎

نہ پوچھو مجھ سے گلشن کی حقیقت　　برس گزرے کہ میں ہوں اور قفس ہے

دنیاوی تعلقات انسان کو عقاید میں کمزور بنا دیتے ہیں جب تک کہ انسان کو ذاتِ باری تعالیٰ پر پورا بھروسہ نہ ہو اس کی نجات مشکل ہے، جب خالقِ مطلق اس کا مدد و معاون ہو تو پھر اوروں کے ناراض ہونے سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہو سکتا ؎

پھرے زمانہ جہاں تک ہی ہم سے یا نہ پھرے　　کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے

دُنیا میں ہر شخص اپنے ذاتی اغراض کی حصول میں کوشاں ہے، دوسروں کی فکر بہت کم کرتا ہے، جو ہے اپنے مطلب کا بندہ ہے ؎

کیا جانے ہم کہاں ہیں اور دین و دل کدھر ہے　　عالم میں تفرقے کی کس کی کسے خبر ہے

خود تو تیرِ نگاہ کے گھایل ہو گئے لیکن ایسا سبق پایا کہ گھبرا اُٹھے، اب دعا کرتے ہیں کہ دوست، دشمن کو بھی اس سے سابقہ نہ پڑے ؎

یارب کوئی اس چشم کا بیمار نہ ہوئے　　دشمن کے بھی دشمن کو یہ آزار نہ ہوئے

آہ، دُنیا میں کوئی مشفق دمساز اور رفیقِ غم گسار نہیں، اپنا حال زار کس سے سُنایا جائے، یا تو دادے دل ہی آسودہ ہے یا

یا پروردگار ہی کو اس کا علم ہے ؎

مرا کوئی احوال کیا جانتا ہے جو گزرے ہے مجھ پر خدا جانتا ہے

شاعر کو خوف ہے کہ اس کے ارادہ کی خبر پاکر لوگوں کو کہیں غلط فہمی نہ ہو، اس لئے وہ اپنی نیک نیتی کا اظہار کرتا ہے تاکہ اس سے واقف ہو کر ان کی بدگمانی دور ہو جائے ؎

بتوں کی دید کی جاتا ہوں دیر میں قائم مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

دُنیا میں عدل و انصاف کا وجود نہیں ہے، کرتا کوئی ہے اور خمیازہ بھگتتا ہے کوئی اور بقول کسی کے "کرے ڈاڑھی والا پکڑا جائے مونچھوں والا" جرم کا ارتکاب تو ایک شخص کرتا ہے لیکن سزا ایک کردہ گناہ کو دیجاتی ہے، یہی آئین جہاں ہے ؎

تجھ سے لگیں تھیں آنکھیں پھنسا مفت میں دل تقصیر تھی کسو کی گرفتار ہے کوئی،

جور و الم سہتے سہتے دُنیا سے طبیعت اُکتا چکی ہے، دُنیا سے خوش معاملگی مفقود ہو چکی ہے، دغا و فریب کی گرم بازاری ہے، دیدہ دلیری تو دیکھئے کہ ایک چیز لیتے ہیں لیکن پھر نہایت سادگی و بے پروائی کے ساتھ انکار کر جاتے ہیں ؎

جی تنگ ہو چکا ہے جور فروشوں کے ہاتھ سے دل دیکھنے کو لے کے جو ظالم مکر گئے

جو چیز مُفت ملجائے اس کے قبول کرنے سے انکار نہیں ہوتا، گو میخواری سے توبہ کی جا چکی ہے لیکن اب تک ہونٹ اس لذت کا مزہ لے رہے ہیں، اس لئے شراب مُفت ملجائے تو انکار نہیں ؎

مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قائم لیکن بے طلب بھی جو ملجائے تو انکار نہیں

چھپ چھپ سے غیر سے ملنے کی شکایت کی تو ایک ادا کے ساتھ پوچھا کیا تم نے خود دیکھا، ان کا خیال ہے کہ میں اس کا ثبوت دینے سے قاصر رہوں گا لیکن بھلا کہیں عاشق سے محبت کی نظریں بھی چھپ سکتی ہیں، اس کا جواب یہی ہے کہ ذرا اپنی آنکھوں طرف دیکھو ؎

آگے مرے نہ غیر سے گو تم نے بات کی سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں

پیدائش اور عطائے حیات سے انسان اعمال کی سزا و جزا کا ذمہ دار ٹھہرا۔ کاش کہ پیدا ہی نہ ہوا ہوتا اور ہمیشہ عدم ہی میں رہتا تو پھر یہ پرسش اور ثواب و عذاب کا مسئلہ ہی درپیش نہ ہوتا، عدم کی زندگی تفکرات اور خیر و شر کی پرسش سے پاک و مبرا تھی، جب خلعت ہستی عطا ہوا اور کتم عدم سے دُنیا میں اس کا ظہور ہوا تو پھر علائق دنیوی کی زنجیر پاؤں میں پڑ گئی ؎

تھا بد و نیک جہاں سے میں عدم میں آزاد آہ کس خواب سے ہستی نے جگایا مجھ کو

ہجر و فراق کی گھڑیاں کبھی تارے گن گن کر وٹ بدلتے گزاریں، خیال یار کوئی وقت ہم سے جدا نہیں رہا، دل میں ایک ٹھیس لگتی ہے اور ہم باچشم پرنم محبوب کا تصور کر کے دل کو ڈھارس دیتے ہیں اور سمجھاتے ہیں کہ اے دل اس قدر مضطرب نہ ہو وہ بھی مجھ سے غافل نہیں ہے، تیری محبت میں وہ بھی بے قرار ہے، ایسی حالت میں جب ہچکی آجاتی ہے تو ہم کہکر دل خوش کر لیتے ہیں کہ اس نے یاد کیا ہے، محبت کے اثر سے اس کا جگر بھی پارہ پارہ ہے، ہندوستان عام طور پر خیال کیا جاتا ہے جب ہچکی آتی ہے اس وقت جس کا یاد کرنا قرین قیاس ہو اس کا نام لیا جائے تو ہچکی بند ہو جاتی ہے، اسی کو شاعر نے اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

ہم نے ہر طرح ترے ہجر میں دل شاد کیا ہچکی گر آئی تو سمجھے کہ ہمیں یاد کیا

شباب کا پرکیف منظر ولولہ اور جوش و خروش سے مملو ہوتا ہے اُمنگ اور حوصلے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، اس عہد کے اعمال خدائے پاک کے نزدیک بھی زیادہ قابلِ قبول ہیں جوان صالح کی دُعا کے استقبال کے لئے اجابت درحق سے پیش قدمی کر کے آتی ہے، تخم ریزی کا اصلی زمانہ ہی ہے، اس عہد میں جیسے اعمال کئے جائیں اس کا نتیجہ ہم کو بعد میں اُٹھانا پڑتا ہے۔ شاعر اسی خیال کو ظاہر کرتے ہوئے نصیحت کرتا ہے، انسان اس زمانہ میں غافل نہ رہے۔

نیک و بد جو تجھے کرنا ہے سو کر لے قائم　　پھر یہ امید نہیں ہے کہ جواں ہوئے گا

معشوق کی بے وفائی اور عاشق سے بے اعتنائی و کج ادائی کوئی نئی بات نہیں ہے، دل لے کے مکر جانا اور ستم زدہ کو جلانا او
اس کی دل آزاری کرنا یہ تو اس کا معمولی کام ہے، بے رخی اور تغافل اس پر قیامت ہے، خصوصاً دل دکھانے کے اور عاشق کو جلانے کے
لئے غیر سے ملنا اور ہنسکر باتیں اور اس سے محو اختلاط ہونا عاشق ناکام پر بجلیاں گراتا ہے مگر بے بس عاشق اپنی قسمت پر قانع ہو کر خامو
رہ جاتا ہے اپنی حرماں نصیبی پر اشک غم بہاتا ہے، لیکن دیکھنے والے غیر لوگ کیسے خاموش رہتے انھوں نے چہ میگوئیاں شروع کیں
شاعر نے اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

غیر سے ملنا تمھارا سن کے گو ہم چپ رہے　　پر سنا ہوگا کہ سن کر اک جہاں نے کیا کہا

عہد و پیماں مکمل ہو چکے، ملنے کا وقت بھی مقرر ہو گیا دل پر ارماں مسرور و شاداں ملاقات کے لئے چلا ہے، لیکن وائے قسمت برگش
کہ جب آرزوئے دیرینہ کا وقت آیا تو ہماری ازلی بدنصیبی رنگ لائی جب کہ ہم در جاناں کے بالکل قریب پہونچ چکے تھے کہ ہم کو بصد یاس و حسر
ناکام ہونا پڑا اس دل خون شدہ کی کیفیت یقینی بے حد قابل تاسف ہے جو کامیابی سے ہم آغوش ہوتے ہوئے یوں ناکام رہ گیا ہو ؎

قسمت کو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند　　دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

کس قدر حسرت و یاس کا مرقع ہے، دلگیر اور ستم زدہ عاشق کی دردناک حالت کا مظہر ہے، سادگی اور طرز بیان کی دلنشینی قابل داد
ملاحظہ ہو ؎

لے گیا خاک بھی ہمراہ دل اپنے قائم　　شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

کوشش اور سعی بہت کچھ کر دیکھی لیکن مطلب برآری نہ ہوئی، کبھی ناراض ہوئے کبھی نہ ملنے کی قسم کھائی، کبھی یہ عہد کر لیا کہ پھر کبھ
اس کی صورت نہ دیکھیں گے، لیکن اس قسم کے عہد پر بھی کوئی قائم رہ سکتا ہے، نظر سے دور ہوئے کہ پھر دیدار جاناں کا خیال دل میں چٹکیا
لینے لگا، ناچار اعتراف شکست کرتے ہوئے پھر در جاناں پر حاضر ہوئے، بہتری کوشش کر دیکھی لیکن دل سے خیال یار کو جدا کرنے میں کامیا
نہ ہوئی اور ادھر وہ ستمگر ہے کہ کسی طرح پسیجتا ہی نہیں، کسی ترکیب کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اس کی بے اعتنائی میں کوئی فرق نہیں آ
آخر کار بدنصیب عاشق مجبور ہو کر اسی کو مخاطب کر کے کہتا ہے ؎

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر　　روٹھا تھا آپ تجھ سے میں اور آپ من گیا

معرکۂ حسن و عشق تو ہمیشہ گرم رہتا ہے، تکرار اور جھگڑا تو امور روزانہ میں داخل ہو گئے ہیں، ادھر سے اصرار ہے اور ادھر سے شا
استغنا، آخر دونوں کا نباہ کس طرح ہو تیز گفتگو اور ناراضگی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے وہ تند خو جلد بگڑ بیٹھتا ہے، محبت کی جنگ بھی عجیب
منظر پیش کرتی ہے، آخر کار اس روزانہ کشمکش نے انتہائی صورت اختیار کی اور فیصلہ کن جنگ کے بعد صلح ہو گئی ؎

قائم ضرور کیا ہے اب اس جنگجو سے صلح　　مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دھو چکا

اُردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی جو نہایت قدیم زمانہ سے فقر و تصوف کا مرکز ہے اس لئے ابتدا ہی سے اس میں صوفیانہ خیالات
کی آمیزش ہو گئی، رفتہ رفتہ صوفیانہ شاعری کو اور زیادہ ترقی ہوئی، لیکن جس زمانہ میں اُردو شاعری ہوئی تو خواجہ میر درد نے سب
پہلے اس زبان کو صوفیانہ خیالات سے آشنا کیا، چنانچہ خود فخریہ کہتے ہیں ؎

پھولے اس زبان میں گلزار معرفت　　یاں میں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا

چنانچہ اس دور کے تمام شعراء مثلاً میر، سودا، اثر، میر حسن، قائم کے کلام بھی صوفیانہ خیالات سے لبریز ہیں، متوسطین نے جس
اور دلآویزی کے ساتھ صوفیانہ خیالات کو ادا کیا ہے، اس کی نظیر کسی اور دور میں نہیں مل سکتی
ہم ذیل میں قائم کے چند اشعار چند عنوانات کے تحت درج کرتے ہیں[1] :-

---

[1] یہ تمام عنوانات معہ اشعار مولانا عبدالسلام ندوی کی شعر الہند حصہ دوم سے نقل کئے گئے ہیں۔

جزو کل کے فرق پر مٹ جا تک اک آتش کو دیکھ — ہے جو قطرے میں وہی ذرہ سی چنگاری میں ہے
کیوں چھوڑتے ہو در دتہ حباب میکشو — ذرہ ہے یہ بھی آخر اُسی آفتاب کا
اُس سے بے ہستی تک اپنی قفرقہ یک مو نہیں — نقطہ وحدت وہیں جوالہ ولیکن دو نہیں

عظمت انسان ——— پر فرشتے کے اس جگہ جل جائیں — جس طرف ہم گزار کرتے ہیں
جس سے گردش میں ہیں خم افلاک — اس مئے تند کا ایاغ ہوں میں

گر فخر ہے تو مجھ سے دگر عار ہے مجھ سے — ہر جنس کی یاں گرمی بازار ہے مجھ سے
احساس نہیں خلق کی نظروں میں دگر نہ — جو شمع یہ سب نرم نمودار ہے مجھ سے
جوں رشتہ تو کمزور سہ امت دیکھیو مجھ کو — مضبوطی ہر سبحہ و زنار ہے مجھ سے
حیوان دگیارا کہ و ساجد ہیں نہ بیجا، — ہر بے خبر خلق خبردار ہے مجھ سے

انسان خدا کا پرتو ہے ——— ہوتے ترے محال ہے ہم درمیاں نہ ہوں — جب تک وجود شخص ہے سایہ نہ جائے گا
انسان کامل نایاب ہے، ——— یوں آدمی کہلا دے ہر گربہ و سگ لیکن — جس سے کہ عبارت ہے انسان وہ عنقا ہے
سیر عالم النفس ——— جز سیر دل اب اور کتابت نہ سبق ہے — جی اٹکے ہے جس میں وہ یہی ایک ورق ہے
موج گرداب کی طرح ہم نے — گھر سے باہر کبھو سفر نہ کیا
گیا نہیں ہوں میں یاں اس طریق سے قایم — کہ جستجو سے کوئی پا سکے سراغ مرا

محاسبہ نفس ——— محاسبہ سے وہ صبح جزائے ایمن ہیں — جو آپ روز و شب اپنا حساب لیتے ہیں
تحفظ نفس ——— دوس کیا دیجئے چور کو قایم، — بند گھر کا میں آپ ورنہ کیا
عظمت قلب ——— خدمت دیر و حرم کی جو میں یک عمر تو کیا — در گہ دل میں تو اب تک شرف اندوز نہیں
انتشار قلب ——— آیا ہوں پارہ دوزی دل سے پٹ بہ تنگ — ایسے پھٹے ہوئے کو میں کب تک رفو کروں
ارشد کی ضرورت اور اسکا اثر — ہو نہ مجھ سے جدا کہ جادہ صفت — منزل عشق کا سراغ ہوں میں
اس کا وہ نقطہ جس سے باندھے کوئی گلدستہ — گو ہیچ ہوں پر مجھ سے جمعیت دلہا ہے

دسلوک کی افسوسناک ناکامی — قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند — دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گئے
عشق حقیقی ——— ہمت عشق نہ ہو حسن خط و خال میں بند — صید ہر مورہ و مگس ہوتے ہیں شہباز کہیں
عشق حقیقی میں ترک آسانی چھوڑ دینی چاہئے — تن آسودہ کو کم لیتے ہیں بازار محبت میں — جو واں چاہے تو ٹوٹا دل کہیں! چشم ترلے جا
ترک خودی ——— اپنے ہی ہونے کے یہ سب ہیں بجھاؤ ورنہ — اس راہ میں ہم نے تو کبھی دام نہ پایا
ترک کر اپنا بھی کہ اس راہ میں — ہر کوئی شایان رفاقت نہیں،

جلال الٰہی انسان کو خود گم کر دیتا ہے — کھولی تھی چشم دید کو تیرے پہ جوں حباب — اپنے تئیں میں آپ نہ آیا نظر کہیں
رضائے الٰہی ——— کیا ساغر ہلاہل و کیا جام آب خضر — آجائے بزم دوست میں جو کچھ سو پیجئے
گشائش موج سے کرنا کوئی مقدور ہے کس کا — میں اور تقریر رضا پیارے جدھر چاہے اُدھر لیجا

الم بمثالی ——— کہتا ہے آئینہ کہ ہے تجھ سا ہی ایک اور — باور نہیں تو لا میں ترے روبرو کروں
خود انہ مذہبی سے آزادی — قایم یہ جی میں ہے کہ تقید سے شیخ لے — اب کہ میں جو نماز کروں بے وضو کروں
سبھی بندے تو خدا کے ہیں پر اتنا ہے فرق — تو گرفتار تعین ہے ہم آزاد ہیں شیخ

اخلاقی شاعری۔ اس کے تحت قائم نے صرف ایک عنوان "علوئے ہمت" کے ماتحت کہا ہے ؎

علوئے ہمت ——— دو جہاں بھی ملیں تو بس ہے ہمیں — یاں کچھ اتنی تو استطاعت ہے

فلک جو دے تو خدائی بھی لے نہ اب قائم — وہ دن گئے کہ ارادہ تھا بادشاہی کا

قائم کو ہم ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے پیش نہیں کر سکتے تاہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس کے کلام میں جا بجا فلسفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں چنانچہ ذیل میں چند اشعار درج کرتے ہیں۔

حقیقت عالم۔ حقیقت عالم کے متعلق فلسفیوں میں سخت اختلاف ہے، ایک گروہ کہتا ہے کہ کوئی چیز اصلی نہیں جو کچھ ہم کو نظر آتا ہے وہ توہمات و خیالات ہیں، ہمارے شعراء نے زیادہ تر اسی خیال کو ظاہر کیا ہے، چنانچہ حضرت خواجہ میر درد فرماتے ہیں:۔

مت جا ترو تازگی پہ اس کے — عالم تو خیال کا چمن ہے

قائم کہتے ہیں ؎

یہ ہست و بود اے دل سب وہم ہی ہے تیرا — جب تھا کبھو تو کیا تھا اور اب نہیں تو کیا ہے

اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا کر قائم یہ کہتے ہیں کہ عالم ایک راز سربستہ ہے ہم سے یہ معمہ حل نہیں ہو سکتا، چنانچہ اسی خیال کو ظاہر کیا ہے ؎

بہت سا غور کو مت دخل دے نسخے میں عالم کے — کہ حاصل دور ہے نظروں سے تیری اس رسالے کا

بظاہر نظام عالم میں سخت ناہمواریاں اور بے ترتیبیاں پائی جاتی ہیں لیکن درحقیقت دنیا کا ایک ایک ذرہ ترتیب و تناسب کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے وہ دنیا کے ایک ذرہ کو بھی ٹھیس لگا کر اپنے مرکز سے ہٹانا نہیں چاہتے بلکہ ہر شخص کو یہ فلسفیانہ مشورہ دیتے ہیں ؎

غافل قدم کو اپنے رکھیو سنبھال کر یہاں — ہر سنگ رہگزر کا دوکان شیشہ گر ہے

قدم مادہ۔ فلسفہ کا یہ مشہور مسئلہ ہے کہ مادہ عالم قدیم ہے تغیر و زوال جو کچھ ہوتا ہے صورت میں ہوتا ہے، مادہ کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ قائم نے اس خیال کو نہایت وضاحت کے ساتھ ظاہر کیا ہے ؎

وہی معنی ہیں گرد و ہوا کے صورت کے ازالہ کا — اگر ژالہ ہو پانی سے وگر پانی ہو ژالہ کا

گئی نہ ہم سے اضافت وجود کی کہ ہم اب — جو خود نہیں تو ہمارا غبار باقی ہے

فطرت بدل نہیں سکتی۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ بعض اشخاص کی فطرت بدل جاتی ہے مثلاً نیک آدمی بد اور بد آدمی نیک ہو جاتے ہیں لیکن یہ فطرت کا تغیر نہیں بلکہ مناسب اوقات میں فطرت ہی کا ظہور ہے خود انسان کی فطرت میں نہ کبھی تغیر ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کو قائم نے زیادہ شاعرانہ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے ؎

ہوس سے ہم کیا تھا عشق اول — وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

دنیا میں رنج ہی رنج ہے۔ دنیا میں اگرچہ خوشی کا حصہ رنج پر غالب نظر آتا ہے لیکن بعض فلسفیوں کو دنیا میں رنج نظر آتا ہے، چنانچہ قائم کہتے ہیں ؎

غم پہ ہستی کی ہے بنا کہ حباب — دل کے کھلتے ہی یاں تمام ہوا

انسان کو صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ انسان کو زیادہ تر علم حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے لیکن حواس کی شہادت بعض فلسفیوں کے نزدیک معتبر نہیں اس لئے ان کے نزدیک انسان کو صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا، قائم فرماتے ہیں ؎

اس کو نہ راست کہہ تو نہ اس کو بتا غلط — کیا جانے کیا صحیح ہے واقع میں کیا غلط

نیکی صرف مذہب میں محدود نہیں — اگرچہ انسان صرف مذہب ہی کو تمام خوبیوں کا سرچشمہ سمجھتا ہے لیکن خوبی صرف مذہب ہی میں محدود نہیں ہے اور چیزوں میں بھی پائی جاتی ہے اس لئے انسان کو ہر جگہ خوبی کی تلاش کرنی چاہئے ؎

حرف کفر و دیں پہ کیا ہے منحصر، ہاں ولاخذ ماصفا دع ماکدرا

نیکی اور بدی فطرت کا نتیجہ ہیں — دُنیا میں نیکی اور بدی کا جو سلسلہ نظر آتا ہے اس کو دیکھ کر بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ بدی کی کیا ضرورت تھی خدا ہر مجسم ہے، وہ صرف بھلائی ہی بھلائی کو پیدا کرسکتا تھا؟ لیکن درحقیقت نیکی کی طرح بدی بھی خدا کی قدرت کاملہ کی دلیل ہے اس لئے نیکی کی طرح بدی بھی ایک نئی چیز ہے، قایم کہتے ہیں ؎

بھلا ہم رند زاہد تجھ سے نیکو کار کیونکر ہوں ظہور مختلف کو چاہتی ہے شانِ خلاقی

برائی اور بھلائی فرضی ہیں — دیدجانس کلبی برائی اور بھلائی کو محض اعتباری اور فرضی چیز خیال کرتا ہے اس لئے وہ کسی رسم و رواج کا پابند نہ تھا، قایم نے اسی خیال کو اس شعر میں ظاہر کیا ہے ؎

فارق نیک و بد دہر ہے تیرا پندار ورنہ کچھ فرق نہیں شبنم و آدینہ میں

خیر و شر اضافی ہیں — دُنیا میں خیر و شر کا حقیقی وجود نہیں بلکہ جو چیز ایک شخص کے لئے مضر نظر آتی ہے وہ دوسرے کے لئے مفید ہوسکتی ہے اس فلسفہ کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

خیر و شر کو تو سمجھ ناداں کہ آب خاک کو نافع ہے آتش کو مضر

دیکھ سرسری اوراق گل کہ یہاں قایم ہے شرح تنگیٔ غنچہ فراغ میں گل کے

برائی کے پیدا کرنے کی مصلحت — برائیوں کے پیدا کرنے کی مصلحت یہ ہے کہ اُن کے مقابل میں جو بھلائیاں ہیں وہ زیادہ روشن اور نمایاں ہوجائیں، جب اندھیرا نہ ہو روشنی کا لطف حاصل نہیں ہوتا ؎

موقوف ضد ہی پر ہے ہر شے کی معرفت کچھ کفر بھی ضرور ہے اسلام کے لئے

عبرت پذیری کے ذریعہ جو انسان کی اخلاقی اصلاح ہوتی ہے وہ بھی انھیں برائیوں کا نتیجہ ہے، مثلاً ایک آدمی برا کام کرتا ہے تو اسکے انجام بد سے واقف ہوکر سیکڑوں آدمی احتراز کرتے ہیں ؎

آوارد کر چمن میں مرے بال و پر نسیم آیندہ تا نہ ہووے کوئی مبتلائے گل

تربیت کے لئے جلدی مضر ہے — دُنیا کے لئے ہر چیز بتدریج ترقی کرتی ہے اس لئے تربیت میں جلدی نہیں کرنا چاہئے ورنہ لازمی طور پر خامی رہ جائے گی، چنانچہ قایم کہتے ہیں ؎

ناپختگی کا اپنے سبب اس ثمر سے پوچھ جلدی سے باغبان کی جو خام رہ گیا

محقق مقلد نہیں ہوسکتا — تقلید صرف عوام کے لئے ضروری ہے، محققین کو تقلید نہیں کرنی چاہئے۔ چنانچہ قایم فرماتے ہیں ؎

جنھیں کچھ سلسلہ میں عشق کی تحقیق حاصل ہے وہ کب مجنوں سے ہر گمراہ کی تقلید کرتے ہیں

گردش زمانہ کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہئے — زمانہ کے حوادث ایک بحر خونخوار کی طرح موجیں مارتے ہوئے چلے آتے ہیں اور ان کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی اُن کو اپنی رو میں کسی کے نفع و نقصان کی پروا نہیں ہوتی اس لئے انسان کا فرض صرف یہ ہے کہ ؎

خس نمط ساتھ موج کے لگ لے بہتے بہتے کہیں تو جائے گا

تجربہ — انسان کو صرف تجربہ ہی تمام خطرات سے بچا سکتا ہے چنانچہ قایم کہتے ہیں ؎

ضایع نہ کر تو دام ہیں صیاد دانہ کو دیکھا ہے لاکھ رنگ سے میں نے زمانہ کو

خمریات — عربی شاعری میں اخطل اور ابونواس اور ایرانی شعراء میں خیام اور حافظ نے اس صنف کو اپنے لئے مخصوص کرلیا ہے اُردو شاعری

میر، سودا، نظیر و میر حسن نے بھی اس طرف توجہ کی لیکن دورِ تغزل کے بعد جب معاملہ بندی کے ساتھ رندی و ہوسناکی کا دور شروع ہوا تو آتش اور تلامذۂ آتش نے اس قسم کے خیالات کو زیادہ شوخ کیا، غالب عموماً شراب نوشی کیا کرتے تھے اس لئے انھوں نے بھی اس لئے انھوں نے بھی اس صنف میں نہایت مستانہ اور پرجوش اشعار کہے اور متاخرین میں داغ و ریاض نے بھی اس میں نمایاں شہرت حاصل کی شاعرانہ حیثیت سے اس صنف کے لئے صرف یہ شرط ہے کہ اشعار برجستہ، صاف، رواں اور مستانہ ہوں اور طرزِ ادا میں جوشش اور الفاظ میں طرب انگیزی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ قائم نے اس صنف میں بھی کہا ہے ؎

آج دل میں ہے کہ کھل کر مے پرستی کیجئے　　خوب مے پیجئے اور دیر مستی کیجئے

سحر ہوئی رات بیتی مے ہے شیشہ میں وہی باقی　　اور کاسادنا ولہا الا یا ایہا الساقی

قائم فارسی زبان میں بھی فکرِ سخن کیا کرتے تھے، اس وقت ملک کی عام زبان فارسی تھی، خط و کتابت، مراسلت، تصنیف و تالیف بھی اسی زبان میں ہوا کرتی تھی، اُردو میں تصنیف کو نامعیوب سمجھتے تھے، ابھی حاتم نے اُردو کی عام ترویج کی طرف توجہ نہیں کی تھی، عام طور پر شعراء بھی فارسی زبان میں اشعار کہا کرتے تھے، چنانچہ فارسی زبان میں بھی قائم کے چند اشعار موجود ہیں نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم نے اپنے تذکرہ "بزم سخن" میں قائم کے فارسی کے دو شعر نقل کئے ہیں ؎

آنانکہ با حلاوت درد تو خو کنند　　زخمی بدل زنند و نمک آرزو کنند

شب کہ انداز ہم آغوشی او یاد کنم　　خویش را تنگ بہر گیرم و فریاد کنم

اس وقت کے اکثر شعراء قائم کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں، اکابر شعرا نے جو بجائے خود استادانِ فن تھے نہایت بلند دلی کے ساتھ قائم کی استادی اور قادر الکلامی کا اعتراف کیا ہے، کئی ایک نے اشعار میں اس جذبہ کو ظاہر کیا ہے اور سودا، درد و میر کے ہم رتبہ قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ ان تینوں استادانِ وقت کی استادی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، ان کے ساتھ قائم کو شریک کر کے انھوں نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ قائم کو وہ کس درجہ اور مرتبہ کا شاعر خیال کرتے تھے، چنانچہ ان اشعار کے پڑھنے کے بعد قائم کی علوئے مرتبت کے بارہ میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا ہے، میر باقر حزیں، مرزا جان جاناں کے شاگرد اور صاحب دیوان تھے، سودا نے ان کا نام اکابر شعراء کے ساتھ لیا ہے، وہ اپنے احساسات اور جذبات قلبی کو یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

داغ ہوں ان سے اب زمانے میں　　بزم شعراء کے جو ہیں صدر نشیں

یعنی سودا و میر و قائم و درد،　　لے ہدایت سے تا کلیم و حزیں

منشی قدرت اللہ شوق اسی عہد کے ایک قادر الکلام شاعر تھے جن کی تصنیفات سے ایک تذکرہ "طبقات الشعراء" یادگار ہے، وہ بھی اساتذۂ وقت کی مدح و ثنا میں یوں گہر افشانی کرتے ہیں ؎

اے شوق تیرے شعر کی ابتو بڑی ہے دھوم　　سودا و میر و قائم درد و الم تلک

تصنیفات

قائم کی تصنیفات سے ایک کلیات اور ایک تذکرہ یادگار ہیں۔ کلیات کے قلمی نسخے ہندوستان میں بعض حضرات کے ہاں موجود ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمیں کوئی نسخہ دیکھنے کے لئے نہیں ملا ورنہ ہم تفصیل کے ساتھ اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے اور مصحفی کے قول کی تائید میں ہم مختلف اصنافِ سخن کے نمونے پیش کرتے جس سے ناظرین کو قائم کی شاعرانہ شخصیت کے متعلق اندازہ کرنے میں بہت آسانی ہوتی، تاہم انڈیا آفس کی فہرست ہندوستانی کتب میں بلوم ہارٹ نے ایک کلیات کی موجودگی کا ذکر کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ کلیات کا آغاز مذکورۂ ذیل اشعار حمد سے ہوا ہے ؎

ہرگز نہیں مقدور تیری حمد زباں کا　　برہان ہے دعوے کے مرے عجز بیاں کا

جب تک کہ ہو تو ہم ہیں تیرے ساتھ ہمیشہ　　جو موج کہ نت لازمہ ہے آبِ رواں کا

اے عشق میرے دوش پہ تو بوجھ رکھ اپنا ہر سر متحمل نہیں اس بار گراں کا

یہ کلیات مجموعہ ہے غزلیات، مخمس، واسوخت، رباعیات اور قصیدوں کا، اور اس میں بادشاہ دہلی، وزیر، میر بخشی، امیر الامرا، نعمت خاں، سودا، نواب عنایت خاں، نواب محمد یار خاں، نواب ہزبر جنگ، نواب نصر اللہ خاں کی شان میں قصاید ہیں، مثنویاں خصوصاً ہجویہ اور مختصر حکایتیں ہیں، ایک مثنوی کا عنوان "رمز الصلات" ہے اور اس کلیات میں سب سے آخری مثنوی "حیرت افزا" ہے جس کے آخری شعر سے تاریخ تصنیف دیوان یعنی ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء) برآمد ہوتی ہے ؎

ہوا ہے جس میں یہ نامہ رقم ہے بارہ سو ہجری میاں سات کم

بلوم ہارٹ لکھتا ہے کہ اس نسخہ میں مثنوی "شدت سرما" اور مثنوی "عشق درویش" شامل نہیں ہیں، البتہ اس کا ذکر گارساں دی تاسی نے کیا ہے، "تذکرہ مخزن نکات" یہ تاریخی نام ہے اس پر اکرم نے تاریخی قطعہ بھی لکھا ہے، اس کتاب کے عنوان سے تاریخ تصنیف یعنی ۱۱۶۸ھ (۵۵-۱۷۵۴ء) برآمد ہوتے ہیں، ایتھے لکھتا ہے کہ "ریختہ گو شاعران قدیم کا یہ ایک زبردست قابل قدر تذکرہ ہے، یہ تذکرہ قابل قدر تذکرہ ہے یہ تذکرہ فارسی میں لکھا گیا ہے، سب سے عجیب بات اس تذکرہ میں یہ ہے کہ قائم اس بات کا مدعی ہے کہ وہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے ہندوستانی شعراء کا یہ تذکرہ لکھا، اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ میر کے نکات الشعرا، فتح علی حسینی گردیزی کے تذکرہ کے وجود سے لاعلم تھا، بلکہ وہ لکھتا ہے کہ اب تک ریختہ گو شاعروں کا کوئی تذکرہ ہی مرتب نہیں ہوا، چنانچہ وہ اس اولیت پر فخر کرتا ہے مگر ہمیں اس بیان کی صداقت پر شبہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے، مگر اس کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، بقول ڈاکٹر سپرنگر "بلاشک و شبہ اس تصنیف میں بہت کچھ اور دلچسپ مواد ہے"

ایک بات جو اس کے قبل کے تذکروں میں نہیں پائی جاتی یہ ہے کہ قائم نے سعدی شیرازی کو ہندوستانی شعراء میں شمار کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ سعدی کے متعلق اور تذکروں کی طرح قائم کو بھی مغالطہ ہوا، سعدی شیرازی نہیں بلکہ سعدی دکنی ہیں یا بقول عبدالحق صاحب یہ سعدی شمال ہند کے باشندے ہیں، اس بیان کی میر اور فتح علی گردیزی نے تردید کی ہے۔

گارساں دی تاسی نے اپنی کتاب "ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف" میں جہاں پر ساتویں تذکرہ کا ذکر کیا ہے، وہاں لکھتے ہیں کہ "قائم نے جو ایک مشہور شاعر ہوا ہے ایک تذکرہ لکھا ہے اس کا نام بھی نکات الشعرا ہے جو علاوہ اس کے طبقات الشعرا کے نام سے بھی معروف ہے اور اس کے بعد جہاں نویں تذکرہ کے متعلق لکھا ہے وہاں لکھتے ہیں" مخزن نکات، قائم کی تالیف ہے اُن کے بیان کے مطابق ہر دو تذکرے تین طبقوں پر منقسم ہیں ہم کو جہاں تک علم ہے، عام طور پر تمام تذکرہ نویسوں نے صرف قائم کے تذکرہ "مخزن نکات" کا ذکر کیا ہے ممکن ہے کہ یہ دونوں نام اصل میں ایک ہی تذکرہ کے ہوں اور گارساں دی تاسی کو غلط فہمی ہوئی ہو۔

اس تذکرہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے :-

"رنگینی کلمات و دلنشینی فقرات بحمد سخن پناہی است کہ بنائے الخ ....."

کل شاعر جن کی تعداد اس میں درج ہے، ایک سو دس ہے، یہ تذکرہ تین طبقوں پر منقسم ہے،

طبقۂ اول :- در بیان اشعار متقدمین، ابتدا سعدی سے ہوئی ہے اور اختتام میر جعفر پر ہوا ہے۔

طبقۂ دوم :- در ذکر کلام سخنوران متوسطین، ابتدا شاہ مبارک آبرو سے ہوئی اور اختتام افغان کمترین پر ہوا ہے۔

طبقۂ سوم :- در بیان اشعار و احوال شعرائے متاخرین، ابتدا میر شمس الدین فقیر سے ہوئی ہے اور اختتام قائم پر ہوا ہے۔

ڈاکٹر سپرنگر اس تذکرہ کے متعلق یہ رائے دیتا ہے، "تاریخ ادبیات اردو کے متعلق یہ ایک قدیم اور نہایت قابل قدر تصنیف ہے"

شاعر کی تاریخ وفات کے متعلق بھی بیحد اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ ۱۲۰۶ھ میں اور کوئی کہتا ہے کہ ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا، بہرحال ۱۲۰۰ھ اور ۱۲۰۱ھ کے درمیان سفر آخرت کیا، شعر و سخن فہمی تو اس کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا، چنانچہ جرأت نے تاریخ وفات کہی ہے ؎

جرأت نے کہی رو کے تاریخ وفات یکتائی کے تھا قائم بنیاد شعر ہندی رہنے کیا کہئے اب آہ

نواب محمد یار خاں امیر، فرزند علی محمد خاں اور نواب فیض اللہ خاں رئیس رام پور کے چھوٹے بھائی تھے، ٹانڈہ کی بود و باش تھی
امذہ شعر و سخن اور سیر و شکار کا شوق تھا، مرہٹہ گردی میں پریشان ہو گئے، فیض اللہ خاں رام پور لے گئے پچاس ہزار روپیہ
ب خرچ کے لئے مقرر کر دیا۔ ۱۱۸۹ھ میں وفات پائی۔

مولف طبقات الشعراء لکھتا ہے :-

"جوانے بود مرزا منش، نازک طبع، صاحب فطرت، اہل مروت، عالی حوصلہ و خوش سلیقہ، حاتم زمانہ در سخاوت و خیرات یگانہ، مجمع مکارم اخلاق و بفیض رسانی و قدر دانی شہرۂ آفاق و در فن موسیقی کہ بحر بیست ذخار و محیط است ناپیدا کنار چنان دستر س تمام داشت کہ فیثا غورس با وجود استادی یکے از شاگردان ابجد خوان او، و تان سین و نایکان دکھن از مدح میزان او بسیار سخن فہم، نکتہ سنج، قدر دان سخن، استادان این فن در فرقہ اہل دل و شخصے بود بے بدل، گاہے طبیب صفائی ذہن و جودت طبع برائے تفنن خاطر بلکہ بفکر شعر ریختہ می پرداخت و داد سخنوری و خوش تلاشی میدارد در اندک ایام مشقے او بر تبہ عالی استادان رسیدہ بود فاما اجلش مہلت نداد"۔

حباب آسا نہ دیکھیں آنکھ اٹھا اسباب دنیا کو — لیا ہے کاسۂ سر سے جنھوں نے کام افسر کا
یاد کرنا ہی مرا آپ کو منظور نہ تھا — گو کہ شب تھی پہ میں اتنا بھی تو کچھ دور تھا

عباس خاں عباس۔

مولف طبقات الشعرا لکھتا ہے :-

"برادر خورد آخونزادہ ارادت خاں کہ از مصاحبان نواب عنایت اللہ بود، جوانے است عالی حوصلہ خوبصورت و پاکیزہ سیرت، باتمکنت و وقار بسیار وجیہ و بردبار حسین و نہایت خوش تلاش، خوش فکر و ذہین است، اگرچہ نومشق ست ذہن رسا و فکر یجا دارد"

جز عشق سوز دیر و کعبہ سے کام ہے — اس کو تو رام رام اور اس کو سلام ہے
تیرے بن اب جو دم ہے یا کہ ایک لحظہ ہے یا ساعت ہے — بلائے جاں ہے، آفت ہے، اذیت ہے، مصیبت ہے

پروانہ علی پروانہ مراد آبادی۔

مولف طبقات الشعراء لکھتا ہے :-

"مردے است دیوانہ، جوانے است مردانہ، مزاج آزادانہ، مشرب رندانہ، ذہنش مناسب و موزوں شاعرانہ، شعر را بآواز بلند میخواند، شاگرد مراد علی حیرت حالا از قائم مرحوم اصلاح میگرفت، دریں ایام جوش جنوں بر خاطرش طاری است"۔

جھوٹ کہتا ہے تو قاصد یہ زبانی پیغام — مجھ کو باور نہیں جب تک کہ نشانی آوے

قدرت تخلص، مولوی قدرت اللہ نام، ساکن رام پور، عبد الغفور خاں نساخ لکھتے ہیں کہ ریختہ گویوں کا ایک تذکرہ اُن سے یادگار ہے۔

لاکھوں جلائے مردہ صد سالہ آن میں — فیض دم مسیح ہے اس کی زبان میں
انصاف بھی ضرور ہے یہ ظلم تا کجا — کتنوں کے جی تو جاتے رہے امتحان میں

طرز تخلص گردھاری لعل نام، قوم کا کایستھ اور باشندہ شاہجہاں آباد کا تھا، مولف طبقات الشعراء نے اس کی ایک رباعی نقل کی ہے۔

کہا زلف میں بل نہ گو شوارہ ٹوٹا — کیا جانئے کس کا دل بیچارا ٹوٹا
دھڑکے ہے مجھے جی کہ اب خدا خیر کرے — اسی رات میں بے طرح ستارا ٹوٹا

بہاری مل، قوم کا کایستھ، باشندہ شاہجہاں آباد کا تھا، ایک مدت تک امروہہ میں مقیم رہا، طبع رسا اور فکر بجا رکھتا تھا۔

آیا نظر ایک طفل فرنگی گورا، سنگین نگاہ — پلٹن سی مژہ کی قلب دل کو توڑا بجرم و گناہ

میں نے کہا ظالم کہیں صاحب سے توڑ دے اس پر مجھے
شرما کے لگا کہنے ہو تھوڑا تھوڑا لے کیا پروا ہ

(۷) بیتاب تخلص، اور سنتوکھ رائے نام تھا، شاہجہاں آباد کا باشندہ، قوم کا کھتری، خلوت پسند تھا، عزلت نشینی کی طرف رجحان تھا، ایک عرصہ تک چاند پور میں گوشہ نشین رہا، کم کہتا تھا، لیکن بہت خوشگو تھا، ایک مختصر سا دیوان بھی ترتیب دیا تھا ؎

غافل نہیں اعتبار پل کا
کیوں فکر عبث کرے ہے کل کا

(۸) مایل تخلص، شاہ محمدی نام، دہلی کے رہنے والے تھے، شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں مرشد آباد میں سکونت کی تھی، آج تمام اساتذہ میں شاعری کا سلسلہ سودا، درد اور مصحفی کی ذات سے قایم ہے، کیونکہ غالب کے سوا دلی میں شاعری کے تمام سلسلے شاہ نصیر، ذوق اور مومن ذات سے قایم ہیں، مومن اور ذوق، شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور مایل کو قایم سے تلمذ حاصل تھا ؎

کیا کیا کہوں میں تجھ سے دل زار کی ہوس
مشہور ہے جہان میں بیمار کی ہوس

(۹) ہادی تخلص، عبدالہادی نام، شاہجہاں آباد وطن تھا، گو سودا کے شاگرد تھے، مگر مشورۂ سخن قایم ہی سے کیا کرتے تھے، اس لئے ان کو بھی زمرۂ تلامذۂ قایم میں شمار کیا جاتا ہے ؎

صدقے ترے ہو کے مر گئے ہم
کرنا تھا جو کچھ کر گئے ہم
خنداں خنداں جدھر گئے ہم
گریاں گریاں اُدھر گئے ہم

(۱۰) کمال تخلص، کمال الدین حسین نام، باشندۂ گڑھ مانک پور شاگرد جرأت، قایم، لباس درویشی پہنکر سیر و سیاحت کرتے تھے، دیوان تذکرۂ شعراء نظر سے گزرا" (سخن شعرا) گارساں دی تاسی نے کمال کے تذکرہ "مجموعۂ انتخاب" کا ذکر کیا ہے اور لکھتا ہے کہ اس کا نام فقیر شاہ محمد شاہ کمال الدین حسین ہے، اس نے قایم کے تتبع میں قایم کے دس سال بعد ۱۸۰۴ء میں اپنا تذکرہ لکھا، جابجا قایم کی تعریف و توصیف کرتا ہے اکثر جگہ قایم کے تذکرہ سے مستفید ہوا ہے، چنانچہ اس نے بھی سعدی شیرازی کو پہلا شاعر قرار دیا ہے، کمال نے اپنے تذکرہ میں قایم کے دیو سے بہت سا کلام نقل کیا ہے، جس میں بیانیہ ہجو اور دوسری قسم کی نظمیں داخل ہیں، ہماری رائے میں یہ کمال وہی ہے جو کہ جرأت قایم کا شاگرد تھا ؎

بگڑے نہ کہیں عاشق و معشوق کی صحبت
یوں بن کے نہ نکلا کرو بازار میں صاحب

گارساں دی تاسی نے قدرت اللہ شوق کو بھی قایم کا شاگرد بتایا ہے، چنانچہ لکھتا ہے:- "تذکرہ ہندی جو طبقات الشعراء کے نام بھی موسوم ہے اس کا مولف شوق بہت پر گو شاعر ہے، قایم چاند پوری کا شاگرد ہے، اس کے گھر میں اکثر مشاعرے ہوتے تھے"
(رسالہ اردو بابتہ جنوری ۱۹۲۸ء)

جس طرح صوفیا کے نزدیک شریعت کے ظاہری و باطنی دو رخ ہوتے ہیں، اسی طرح محققین کے نزدیک شاعری بھی خارجی اور دا دو حصوں میں منقسم ہے، خارجی شاعری میں اشیاء کے ظاہری خط و خال نمایاں کئے جاتے ہیں اس لئے اس سے صرف مناظر قدرت، وصف نگا مداحی اور واقعہ نگاری میں کام لیا جا سکتا ہے کیونکہ ان تمام اصناف سخن میں شاعر صرف انھیں چیزوں کی تصویر کھینچتا ہے جو محسوس طور آتی ہیں خود اُس کو اپنے اندرونی جذبات کی آمیزش سے ان تمام چیزوں کو علٰحدہ رکھنا پڑتا ہے لیکن غزل میں تمام تر شاعر کے اندرونی جذبات و کی کی تشریح ہوتی ہے اس لئے اس میں صرف شاعری کے داخلی پہلو سے کام لیا جاتا ہے اور قدما کے کلام کا اصلی امتیازی وصف یہی ہے کہ انھوں شاعری کے دونوں حصوں کو بالکل الگ الگ رکھا، یعنی قصاید وغیرہ میں خارجی حصہ سے کام لیا اور غزل کو تمامتر جذبات و کیفیات سے لب کر دیا، ذیل میں ہم قایم کے منتخب کلام کا ایک حصہ درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے گا۔

رکھیں اپنے تئیں پھر کس طرح دوست
ہو تجھ سا شخص جب دشمن ہمارا

میں کن آنکھوں سے دیکھوں کہ سایہ ساتھ ہو تیرے
مجھے چلنے دے آگے یا ٹک اس کو پیشتر لے جا،

ادب سے آدمی آنکھوں میں خوب لگتا ہے — مگر یہ فرقہ وہاں ہو جس قدر گستاخ

جانتی ہے نسیم اس گلی کو، — آٹھ سکے تو قافلہ ہے بہتر

سو جائے منہ لپیٹ کے جو باد میں تیری — سو جاگتے خفیف ہیں اس خواب کے حضور

آج آپ میرے حال پہ گریے ہیں بے سبب — اشفاق، عنایات، کرم، مہر، تلطف

وہی عاشق کی تیرے حسرتِ دیدار سمجھے گا — کھلی رہجائیں بعد از ذبح جس نخچیر کی آنکھیں

ہے گو کہ جذب مرا تار عنکبوت سے سست — پہ شیر پھانسے ہیں اکثر اسی کمند سے میں

لبریز شوق میرا از بسکہ مو بمو ہے — سمجھا نہ میں یہ اب تک یہ میں ہوں یا کہ تو ہے

شبنم کے برگ گل پہ ڈھلنے پہ میں یہ سمجھا — جو دیدہ در ہے اس کو شوق رخ نکو ہے

ہے رفو صرف سے جامہ کا مرے تار و پود — بسکہ میں پھاڑا کیے اور یار سلواتے رہے

قسمت کہ وہ چارہ گر ہے اپنا — جو زخم سے تار رفو نہ سمجھے

شایان چمن نہیں وہ بلبل — ہر گل کا جو رنگ و بو نہ سمجھے

غنچہ نے کس کے بوسہ کو یہ لب کئے ہیں جمع — گل کیوں بنا ہے باغ میں صورت کنار کی

کلام کا انتخاب یہ ہے :-

عہدہ اس صنم کے بر آیا نہ جائے گا — یہ ناز ہے تو ہم سے اٹھایا نہ جائے گا

کعبہ اگر جو ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ — کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

کہاں ہے شیشۂ مے محتسب خدا سے ڈر — مری بغل میں جھلکتا ہے آبِ دل کا سا

لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنا قایم — شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

ناصح تو کہے ہے یوں کہ گویا — ہے دل پہ کچھ اختیار میرا

اب تو نہ گل نہ گلستاں ہے یاد — اس کے کھڑے کی ہر زباں ہے یاد

بھلا اے ابر مژگاں اب تو بس کر — ابھی تو کھل گیا تھا تو برس کر

کیوں کیا مجھ کو تو صیاد گرفتار قفس — نہ میں شایستہ بسمل نہ سزاوار قفس

جو سوزِ عشق کا چرچا وہاں نہیں قایم — تو کیا میں جاؤں گا دینے بہشت میں آتش

اے محنت آزمائے عاشق، — تب خوش ہو کہ مر ہی جائے عاشق

آئے خزاں چمن کی طرف گر میں رد کروں — غنچہ کرے کلوں کو صبا گر میں بو کروں

جو رسپہر دورے یاراں و روئے غیر، — جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو اب دیکھتا ہوں میں

کسی بلا میں پھنسے قید ہوئے یاں سے جائے — پر آدمی کو نہ تجھ پہ مبتلا نہ کرے

شیخ جی آیا نہ مسجد میں وہ کافر ورنہ ہم — پوچھتے تم سے کہ اب وہ پارسائی کیا ہوئی

کیا پوچھتے ہو موجب آزردگی یار — دل لے چکے مدت ہوئی اب جاں طلبی ہے

قتل کرنے سے میرے تو بھی ہوا کہ مفصل — غرق آب شرم میں اب تک دم شمشیر ہے

نہ مرنے دیتے ہم قایم کو لیکن — خدا داری سے کچھ چارہ نہیں ہے

اپنے مذہب میں قرابت نہیں ابرو کی شرط — جس سے نسبت ہے تجھے اس سے ہمیں خویشی ہے

میں اس چمن سے اور یہ مجھ سے چمن گیا
لے دل میں اپنے حسرتِ سرو و سمن گیا

شیریں تو ساتھ خسرو کے کر ذوق سے معاش
پتھر تھا تیری چھاتی پہ سر کو ہکن گیا

روؤں گا زیرِ سایۂ دیوار بیٹھکر
جس دن تری گلی میں کہیں داؤ بن گیا

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا آپ ہی تجھ سے میں اور آپ ہی من گیا

اب کے جو یہاں سے جائیں گے ہم
پھر تجھ کو نہ منھ دکھائیں گے ہم

ہاں کیوں نہ ملیں گے تجھ سے ظالم
جب گالیاں نت کھائیں گے ہم

آزردہ ہو غیر سے لڑو یہاں
اس عہدے سے کب برآئیں گے ہم

ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا
ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم

یوں چاہئے چاہ کا سرشتہ
قائم ہیں تو کر دکھائیں گے ہم

خوش رہ اگر اے دل تو شاد نہیں
یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں

تیرے دامن تلک ہی پہونچوں اور
خاک ہونے سے کچھ مراد نہیں

میں کہا عہد کیا کیا تھا رات
ہنسکے کہنے لگا کہ یاد نہیں

نہ دل میں آب ہے نہ نم رہا آنکھوں میں
کبھی تھے روئے سو خوں جم رہا ہے آنکھوں میں

میں مرچکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کے لئے
حباب وار ذرا دم رہا ہے آنکھوں میں

موافقت کی بہت شہریوں سے میں لیکن
وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں

وہ محو ہوں کہ مثالِ حباب آئینہ
جگر سے اشک نکل تھم رہا ہے آنکھوں میں

جو کہ چہلیں تھیں سو وہ ہائے گئیں یار کے ساتھ
سر پٹکنا ہی پڑے گا در و دیوار کے ساتھ

ایک ہم خار تھے آنکھوں میں سبھی کے سو چلے
بلبلو خوش رہو تم اب گل و گلزار کے ساتھ

میں ہوں دیوانہ سزا کا مجھے مت قید کرو
جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

یاس میں تجھ غم کے میں اپنی بھی غمخواری نہ کی
جان دے گزرا پہ ظاہر دل کی بیماری نہ کی

دمبدم اس رنجشِ بیجا کو کیا کہتے ہیں شوخ
دل دیا تجھ کو تو کچھ میں نے گنہگاری نہ کی

بعد خط آنے کے اس سے تھا وفا کا احتمال
لیک واں تک عمر نے اپنے وفاداری نہ کی

زاہد در مسجد پہ خرابات کی تو نے
جی بھی یہی چاہے تھا کرامات کی تو نے

ادھر تو میں نالاں ہوں اُدھر غیر نہ جانے
اب کس سے مری جان ملاقات کی تو نے

قائم رہ پُر خوف ہے اور دور ہے منزل
کب پہونچے گا ظالم جو نہیں رات کی تو نے

دل مرا دیکھ دیکھ جلتا ہے
شمع کا کس پہ دل پگھلتا ہے

ہمنشیں ذکر یار کر کچھ آج
اس حکایت سے جی بہلتا ہے

کونسا رنگ جو ہے دنیا میں
میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہے

ہر طرف وہ نگاہ لڑتی ہے
کبھی ادھر بھی آن پڑتی ہے

کیا ہی کھڑا ہے یہ کہ جسکے حضور
آئینہ کی قلعی اُدھڑتی ہے

قائم آیا ہے اب وہ بن ٹھن کر
دیکھیں کس کس کی یاں بگڑتی ہے

مثنوی در شدت سرما

سردی اب کی برس ہے اتنی شدید — صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
اندنوں چرخ پر نہیں ہے مہر — گود میں کانگڑی رکھے ہے سپہر
پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے — سبزہ شال کی رضائی ہے
دیکھ گل پر صبا نہیب برد — بھرتی پھرتی ہے ہر طرف دم سرد
جس طرف اب نگاہ جاوے ہے — جو ہی جیوں بید تھرتھراوے ہے
بے حرارت ہیں سردی کے مارے — طرح یعقوب کے اب انگارے
ہے یہ آفت چراغ تک در پے — لوکو با کہربائے شمع ہے
جاڑا لگنے کا یخ تلک ہے حرف — لپٹی رہتی ہے نمدوں ہی میں برف
شب جو رخشندگی بر برق آوے — ابر میں یوں ٹھٹھر کے رہ جاوے
کیا کروں اس کے حسن کی تقریر — جوں کسوٹی پہ سونے کی ہو لکیر
باد سے برگ کھڑکے ہیں ایں بھانت — کہ تو باجتے ہیں دانت سے دانت
آگ بھی ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی ہے — گودوں کے بیچ چھپتی پھرتی ہے،
دیں ہیں بر باد ٹھنڈ سے ایک دست — جو کوئی ہے سو آفتاب پرست
گر کسی مہروش کو دیکھے ہے — شیخ بھی اپنی آنکھیں سیکے ہے
دن کو کٹتی ہے دھوپ میں اوقات — کالے کمبل میں رات کاٹی ہے رات
قایم آخر ہے سردی کا مذکور — شعر بھی گرخنک ہوں رکھ معذور
آگے جاتا نہیں ہے اب بولا — ہو گئی ہے زبان بھی اولا

حکایت

حکایت یہ ایک زن سے ہے یادگار — کہ تھی سخت اوباش اور بہزہ کار
کیا اُن نے آچاہے اپنے سوال — کہ ہیں مرد پر چار عورت حلال
ہے کیا قہر چار عورت اور ایک مرد — کہا اُن نے سن اس کو بھر آہِ سرد
خدا اور پیغمبر جو تھا مرد تھا — ہمارا وہاں کون ہمدرد تھا،

مخمس

شیخ تو نابود ہودے یا ترا پندار نیست — بتکدہ ویراں ہوں یا ہوں برہمن یکبار نیست
کام کیا ہے مجھ کو گو ہوں راہب و دیندار نیست — کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

عاشقوں کے رونے کی کچھ اور ہی ہوتی ہے دھن — دیکھ ہم روتے ہیں لختِ دل جو تو چاہے ہے تو جن
ہم نہ کہتے تھے تجھے ظالم کہ آیا بات سن — ابر را با دیدۂ گریانِ من نسبت مکن
نسبت باریدگی دارد ولے محو نبار نیست

فلاسفہ کا تصورِ الٰہ

(بہ سلسلۂ ماہ مئی ۱۹۵۸ء)

(نواب) محمد عباس طالب صفوی

۱۷۔ فلاطینس سکندرِ اعظم کے انتقال کے بعد اُس کی وسیع سلطنت سکندرِ اعظم کے تین سپہ سالاروں میں تقسیم ہوگئی اور مصر کا ملک ٹالمی نامی جنرل کے حصہ میں آیا۔[1] ٹالمی اور اس کی نسل کے اور بادشاہ علم و فضل کے سرپرست تھے اور اُن کے زمانہ میں مصر کا دارالسلطنت اسکندریہ تجارت اور علم کا مرکز بن گیا تھا بلکہ پروفیسر وبیر کے الفاظ میں اسکندریہ فلسفہ میں بھی خود ایتھنز سے بازی لے گیا تھا اور اگر کسی کو افلاطون اور ارسطو کے روحانی جانشینوں کی تلاش ہوتی تو وہ جانشین ایتھنز کے بجائے اسکندریہ میں ملتے۔[2]

اس عصر میں نہ صرف یہودیوں کے عہد نامۂ عتیق کا ترجمہ ہوا بلکہ ایشیا کے اور اقوام کی کتابوں کا بھی یونانی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور پہلی صدی عیسوی میں اسکندریہ کے کتب خانہ میں سات لاکھ کتابیں موجود تھیں۔[3]

مغرب کے نام نہاد مورخین کتب خانۂ اسکندریہ کو جلانے کا الزام بالعموم حضرت عمرؓ پر عاید کرتے ہیں لیکن پروفیسر برٹرنڈ رسل نے ۱۹۵۴ء کی شایع شدہ تصنیف میں ان الفاظ میں اس غلط اور بے بنیاد الزام کی تردید کی ہے، "ہر عیسائی کو یہ بتایا جاتا ہے کہ اسکندریہ کا کتب خانہ خلیفہ نے برباد کر دیا لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ کتب خانۂ اسکندریہ کئی مرتبہ تباہ ہوا اور کئی مرتبہ از سرِ نو قایم کیا گیا۔ کتب خانۂ اسکندریہ کو سب سے پہلے مشہور رومن فاتح جولیس سیزر نے تباہ کیا اور آخری مرتبہ جس شخص نے برباد کیا وہ خلیفہ کا کیا ذکر خود پیغمبرؐ اسلام کے عصر سے بھی پہلے گزرا تھا۔"[4]

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ فلسفۂ یونان کے دونوں مرکزوں یعنی ایتھنز اور اسکندریہ کی تباہی "وحشی ایشیا" کی کسی قوم کے ہاتھوں نہیں بلکہ "مہذب یورپ" کی متمدن رومن قوم کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوئی یعنی جس طرح کتب خانۂ اسکندریہ کو سب سے پہلے ایک مشہور رومن حکمراں جولیس سیزر نے برباد کیا اسی طرح ایتھنز کے مدارس فلسفہ کو ۵۲۹ء میں عیسائی رومن شہنشاہ جسٹی نی ان نے جبراً بند کر دیا۔[5]

یونان ۱۴۶ ق م میں رومۃ الکبریٰ کا ایک صوبہ بن گیا تھا اور مصر، کلیوپٹرا کے انتقال کے بعد ۳۰ ق م میں سلطنتِ

---

۱ A History of Western Philosophy page 244.
۲ History of Philosophy page 122
۳ Ibid page 123.
۴ Human Society in Ethics & Politics p 218
۵ History of Philosophy By Weber page 142

رومۃ الکبریٰ کا ایک جزو ہو گیا تھا اور خوش باش یونانی جن کی زندہ دلی مقدونیہ کی حکومت کے زمانہ میں ختم ہو گئی تھی، اب ایک غیر قوم کی حکومت میں بالکل بجھ کر رہ گئے تھے۔

اس مردہ دلی کا اثر فلسفہ پر بھی پڑا اور پروفیسر برٹرنڈ رسل کے الفاظ میں ارسطو کے بعد ہر یونانی فلسفی نظریۂ عزلت کا حامی بن گیا[1] تھا اور دنیا سے عزلت گزینی کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ آخرت کے خیال پر زیادہ زور دیا جائے۔ آخرت کے تصور نے متضاد فلسفیوں میں بھی کم از کم تصورِ الٰہ اور تصورِ عالم پر آخرت میں ایک حد تک ہم آہنگی پیدا کر دی تھی اور اسی ہم آہنگی کا نام فلسفۂ انتخاب ہے یعنی جب کہ فلسفۂ رواقیین کے بانی زینو رواقی کی تعلیم میں نظریۂ خیر کا کوئی وجود نہیں تھا[2] اور جبکہ متقدمین رواقیین خدا کو مجسم مانتے تھے رواقیین کے متاخرین کے نزدیک نیک کام کرنا ہی فلسفہ تھا اور نہ صرف خدا بلکہ روح کو بھی جسم اور نفس سے ایک علیحدہ حقیقت تصور کر کے رواقیین نے اپنے فلسفے میں افلاطون کے فلسفہ کو بھی شامل کر لیا تھا[3]۔ اسی طرح ایپی کیورس کے متبعین کے علاوہ افلاطون اور ارسطو کے پیروؤں نے بھی اپنے مخصوص نظریات میں دوسرے فلاسفہ کے خوش آیند نظریات کو مدغم کر لیا اور رومۃ الکبریٰ میں فلسفۂ یونان کی جس صورت نے نشوونما حاصل کی وہ حقیقتاً یہی فلسفۂ انتخاب تھا[4]۔ جس نے مصر وغیرہ میں یہودیت اور نصرانیت سے متاثر ہونے کے بعد اس حد تک مذہبی شکل بھی اختیار کر لی تھی کہ یونان کے صنمیاتی دیوتاؤں کو خدا کا مظاہر سمجھ کر کثرت کو وحدت میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور نہ صرف فلسفۂ یونان کی پوجا کی جاتی تھی بلکہ الہام کو صحیح تسلیم کر کے دوسری قوموں کے بانیان مذہب بھی عزت کی جاتی تھی اور آرفیس۔ فیثاغورث اور افلاطون کو حضرت موسیٰ حضرت ایسعاہ اور سینٹ پال کا ہم نوا سمجھا جاتا تھا اور ماڈیریٹس نکومیکس اور نیومینیس ایسے روشن خیال مفکرین حضرت موسیٰ کو یہودی افلاطون اور افلاطون کو ایتھنز کا موسیٰ کہہ کر خوش ہوتے تھے[5]۔

اسی ماحول میں جو سیاسی اعتبار سے ناخوشگوار لیکن مذہبی اعتبار سے سازگار تھا فلسفۂ یونان کے دور آخر [illegible] سے [illegible] افلاطینس سنہ ۲۰۴ء میں مصر میں پیدا ہوا[6]۔ چونکہ فلاطینس ننگِ وجود سے اس حد تک شرمندہ تھا کہ اس نے اپنے والدین یا اپنی قوم یا اپنے وطن کے بارے میں گفتگو کرنا پسند نہیں کیا[7] لہٰذا فلاطینس کے ابتدائی حالات پردۂ خفا میں ہیں اور شاید اسی وجہ سے پروفیسر آرم اسٹرانگ نے اپنی ۱۹۵۳ء کی شایع شدہ تصنیف پلوٹینس میں تحقیق کی طرف سے آنکھ کچھ اس طرح بند کی ہے کہ اس کی مثال متمدن انگلستان میں تو کیا نیم متمدن ایشیا میں بھی مشکل سے نظر آئے گی بایں معنی کہ پروفیسر صاحب نے درج لا تصنیف کے صفحہ ۱۳ پر تو یہ درج کیا کہ فلاطینس کا استاد ایمونیس ابتداءً عیسائی تھا پھر اس نے یہ مذہب ترک کر دیا۔ صفحہ ۲۲ پر ارشاد فرمایا کہ یہ ممکن ہے کہ ہیروکلیز کے بیان کے مطابق ایمونس نے اس عقیدے کی تعلیم دی ہو کہ خدائے واحد نے محسوسات اور معقولات کی کائنات کو لاشے سے خلق فرمایا اور اگر یہ صحیح ہے تو چونکہ لاشے سے تخلیق تسلیم کرنا یونانی مذاق کے خلاف ہے لہٰذا یہ

---

[1] A History of Western Philosophy Page 255
[2] Ibid page 280
[3] "مختصر تاریخ فلسفۂ یونان" صفحہ ۲۴۴
[4] A History of Philosophy By Thilly Page 146
[5] History of Philosophy By Weber pp. 125-28
[6] A History of Western Philosophy Page 308
[7] Plotinus By Prof. Amstrong page 48.

ماننا پڑے گا کہ ایمونیس پر عیسائی مذہب ترک کرنے کے بعد بھی عیسائیت اثر انداز ہوتی رہی، لیکن صفحہ ۲۵ پر ایمونیس سے شخصِ بصر فرمانے کے بعد یہ فرمایا کہ "اگرچہ فلاطینس کے شاگرد پارفری کی عیسائیت سے واقفیت اور مخالفت مسلّم ہے تاہم کوئی شہادت ایسی موجود نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ فلاطینس عیسائیت سے براہ راست واقف تھا اور اگرچہ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ فلاطینس پر عیسائیت کا بالواسطہ بھی اثر نہیں پڑا لیکن اس بالواسطہ اثر کو ثابت نہیں کیا جا سکتا" اور پھر خود اپنے اقوال سے صرفِ نظر کرنے کے بعد اسی صفحہ ۲۵ کے آخر میں یہ ارشاد ہوا کہ "فلاطینس مسلمہ عیسائیت سے نہ سہی کم از کم ایک ملحد عیسائی فرقے کے عقاید سے خوب واقف تھا اور فلاطینس کے صحیح یونانی مذاق پر اس ناسٹک فرقے کے مشرقی نظریات اور تھے" اور صفحہ ۲۷ پر مسٹر کواس پل کے اس قول کی صداقت کو بھی تسلیم کر لیا کہ فلاطینس کے زمانہ میں نو افلاطونیت - ناسٹک ازم اور عیسائیت کے تین دریا بہتے تھے جو پلوں اور نہروں کے ذریعہ سے ملنے کے باوجود علٰحدہ تھے۔

اس انگریز محقق کے علم الرغم ایک امریکن محقق پروفیسر اسٹیس اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ فلاطینس کا فلسفہ یونانی فلسفہ نہیں تھا بلکہ چونکہ فلاطینس ۲۰۵ء میں پیدا ہوا تھا لہٰذا وقت کے اعتبار سے اس کے فلسفہ کو عیسائی عصر کی پیداوار سمجھا جائے گا چونکہ اس کے فلسفہ کا مرکز اسکندریہ یونانی شہر نہیں بلکہ ایک ایسا آفاقی شہر تھا جہاں تمام اقوام کو ملنے جلنے کا موقع حاصل تھا اور جو مشرق و مغرب کا سنگم تھا اور چونکہ فلاطینس کے فلسفیانہ نظریات علی الاکثر غیر یونانی اور غیر یورپین ہیں لہٰذا فلاطینس کی نو افلاطونیت کو مشرق اور مغرب کے اتصال کا نتیجہ سمجھنا پڑے گا[1]

فلاطینس کے لکچر نوٹس فلاطینس کے ارشد تلامذہ ایمی لیس جنیٹی لی اینس نے سو مجلدات میں مرتب کئے تھے لیکن افسوس ہے کہ تیسری صدی عیسوی کی اس اہم کتاب کا کوئی جزو باقی نہیں ہے[2] اور اب فلاطینس کے تعلیمات جاننے کا واحد ذریعہ اسکے ایک دوسرے شاگرد پارفری کی تالیف ہے جس کا خلاصہ لورپول یونیورسٹی کے یونانی زبان کے پروفیسر اے - ایچ - آرم اسٹرانگ نے ۱۹۵۳ء میں پلاٹینس کے نام سے شایع کیا ہے۔

فلاطینس کے نظریات کے تضاد پر ڈاکٹر ویبر نے یہ اعتراض کیا ہے کہ فلاطینس کی رائے کو قیام نہیں تھا۔ یعنی وہ اپنے عصر کے متبع شیلنگ کی طرح کبھی تو خدا کو روح اور مادے دونوں سے بالاتر کہتا تھا اور کبھی جسم کے مقابلہ میں خدا کو روح تصور کرتا تھا لیکن اگر تصورِ الٰہ کے متعلق متضاد نظریات پیش کرنا کوئی جرم ہے تو پھر پروفیسر آرم اسٹرانگ کے الفاظ میں فلاطینس پر منحصر نہیں کسی بڑے سے بڑے فلسفی کے نظریات میں بھی تسلسل اور ہم آہنگی نظر نہیں آتی[3] مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ عصر حاضر کے فلاسفہ نے جو متضاد خیالات کا اظہار فلاطینس کے متضاد نظریات کے مطالعہ کے بعد کیا ہے اتنے متضاد خیالات کا اظہار کسی اور فلسفی کے متعلق شاید کبھی نہیں کیا گیا۔

تقدس آب ڈین ایچ ڈی - ڈی نے فلاطینس کو نہ صرف سب سے بڑا مذہبی فلسفی تسلیم کیا ہے بلکہ اس امر کا بھی اظہار فرمایا ہے کہ موصوف نے تیس برس سے اپنی رگِ جاں کو فلاطینس کے فلسفہ کے اوراق کا شیرازہ بنا رکھا ہے اور عسرت و عشرت میں ممد

---

۱ A Critical History of Greek Philosophy p. 368
۲ Plotinus By Armstrong page 161
۳ History of Philosophy By Weber p. 130 Foot Note 2
۴ Plotinus By Armstrong page 29.

کے لئے فلاطینس خضرِ راہ ثابت ہوا ہے[1]، اسی طرح ہمارے زمانہ کے سب سے بڑے منکرِ خدا[2] فلسفی پروفیسر برٹرنڈرسل نے بھی نہ صرف فلاطینس کے ان دلایل کو عمدہ تسلیم کیا ہے جو اُس نے مادیین کے خلاف پیش کئے تھے بلکہ روح اور جسم کے تعلق کے متعلق فلاطینس کے نظریہ کو افلاطون اور ارسطو کے نظریات سے زیادہ واضح تحریر کیا ہے[3] لیکن ان دونوں کے برعکس پروفیسر اسٹیس کے قول کے مطابق محققین کو اس امر میں تامل ہے کہ فلاطینس کے فلسفہ کو فلسفۂ یونان میں شامل کیا جائے اور شاید اسی تامل کی وجہ سے ارڈمین نے اپنی تاریخ فلسفہ میں فلاطینس کے فلسفہ کا ذکر درمیانی عصر میں کیا ہے[4] اور خود پروفیسر اسٹیس نے ان الفاظ میں اپنے خیال کا اظہار فرمایا ہے "متشککین کو تلاشِ حقیقت میں عقل کا بھروسا نہیں رہا تھا اور نو افلاطونیت کا وجود عقل سے مایوس ہونے کے بعد ہی ممکن ہوا، یعنی یونانی افکار جس حقیقت کو عقل کی مدد سے تلاش نہیں کر سکے تھے، اس حقیقت کو وجدان کے سہارے سے تلاش کیا جانے لگا لیکن چونکہ فلسفہ کی بنا عقل پر ہے لہذا وجدان یا سرورِ روحانی یا سُکرِ وجدانی کو عقل سے بالاتر کہنا فلسفہ کی موت کے مترادف ہے۔ حقیقتِ امر یہ ہے کہ نو افلاطونیت کی وجہ سے فلسفہ نے خودکشی کر لی اور نو افلاطونیت کی سرحد میں آکر فلسفہ ختم ہو گیا اور پھر نشاۃِ جدیدہ تک فلسفہ کا احیاء نہ ہو سکا[5]"

بہرنوع چونکہ جس طرح پروفیسر وہائٹ ہیڈ کی نظر میں افلاطون کا فلسفہ متن ہے اور تمام یورپین فلسفہ اُس کی شرح[6]۔ اسی طرح میرے خیال میں فلاطینس کا فلسفہ متن ہے اور ہمارے عصر کے مذاہبِ اسرار علی الخصوص تصوف اس فلسفہ کے فٹ نوٹس ہیں بنا برایں میں دوسرے یونانی فلاسفہ کے مقابلہ میں فلاطینس کے متضاد نظریات زیادہ تفصیل سے سپردِ قلم کرتا ہوں لیکن ان نظریات کو سمجھنے کے لئے چار باتوں کو ذہن نشین کر لینا چاہئے اولاً یہ کہ فلاطینس کا استاد امونیس جس سے فلاطینس نے گیارہ برس فلسفہ کی تعلیم حاصل کی شروع میں عیسائی تھا اور عیسائی مذہب ترک کرنے کے بعد بھی تمام یونانی فلاسفہ کے برعکس لاشے سے تخلیق کا قایل تھا اور باوجودیکہ پروفیسر آرم اسٹرانگ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ فلاطینس عیسائیت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ واقف نہیں تھا تاہم موصوف کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ امونیس کے تعلیمات فلاطینس کے فلسفہ کا سنگِ بنیاد ہیں[7]۔

ثانیاً یہ کہ پروفیسر آرم اسٹرانگ کے اس دعوے کے برعکس کہ فلاطینس کبھی بھی مشرقی مفکرین سے نہیں ملا[8]۔ خود پروفیسر صاحب کا یہ قول موجود ہے کہ اُنتالیس برس کی عمر میں فلاطینس کے دل میں ایرانی اور ہندوستانی فلسفہ سیکھنے کا شوق پیدا ہوا اور اس جذبۂ شوق کی تسکین کے لئے ۲۴۳ء میں فلاطینس، شہنشاہ گارڈین کے ہمراہ عراق تک گیا لیکن ۲۴۴ء کے آغاز میں گارڈین کو خود اس کی فوج نے قتل کر دیا اور فلاطینس کو عراق سے واپس آنا پڑا[9]۔ بہرنہج عراق میں کسی نہ کسی مشرقی مفکرین سے ملاقات کے امکانات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ثالثاً یہ کہ نہ صرف شہنشاہ گارڈین کو اس کی فوج نے قتل کیا تھا بلکہ پروفیسر رسل کے الفاظ میں "فلاطینس کی

---

[1] "Mysticism In Religion" Page 120

[2] "I Believe" Page 262

[3] A History of Western Philosophy Page 310

[4] A Critical History of Greek Philosophy Page 368

[5] Ibid Page 377

[6] Guide To Philosophy By Joad (1953) Page 312

[7] Plotinus Page 13

[8] حوالۂ سابق

[9] حوالۂ سابق

پیدائش سے کچھ قبل رومۃ الکبریٰ کی فوج کو اپنی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا اور فوجیوں نے یہ وطیرہ اختیار کر لیا تھا کہ مختلف افراد انعام لے کر شہنشاہ بنائیں اور پھر انھیں قتل کر کے انعام کی امید پر دوسروں کے پاس جائیں[1]۔ ظاہر ہے کہ طوائف الملوکی کے اس دور میں فلاطینس کا خدا ارسطو کے خدا کی طرح بے دست و پا نہیں ہو سکتا تھا۔

رابعاً یہ کہ فلاطینس نسلاً کوئی بھی ہو لیکن فکراً یقیناً یونانی تھا اور یونانی افکار نہ صرف فلاطینس کے فلسفہ میں جلوہ فرما تھے بلکہ فلاطینس کی سیاست میں بھی کارفرما تھے اور جب ۲۴۳ء میں مصر کی سکونت ترک کر کے فلاطینس نے رومۃ الکبریٰ میں اپنا مدرسۂ فلسفہ قایم کیا[2]۔ اور کچھ برس بعد شہنشا گیلی نس اُس پر مہربان ہوا تو افلاطون کی مثالی جمہوریت کی یاد میں فلاطینس نے گیلی نس سے درخواست کی کہ روم کے پاس ایک اور شہر آباد کیا جائے جس کا نام پر لیٹیو نوپولس ہو اور جس میں افلاطون کی جمہوریت بروئے کار لائی جا سکے[3]۔

فلاطینس کی تصنیف سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ نظر ثانی سے محروم رہی بایں معنی کہ بعض اوقات ایک ہی رسالے میں قطعاً متضاد نظریات پیش کیے گئے ہیں اور خود فلاطینس کے شاگرد پرفری نے جو فلاطینس کے تعلیمات اور سوانح حیات کا جامع ہے یہ بیان کیا ہے کہ فلاطینس نہ صرف بایں معنی کم استعداد تھا کہ اُس کی تحریر میں بھی اغلاط ہوتے تھے اور تقریر میں بھی بلکہ نگاہ کی کمزوری کی وجہ سے فلاطینس اپنی کسی تحریر پر کبھی نظر ثانی نہیں کرتا تھا[4]۔

فلاطینس کی تثلیث خدا۔ Nous اور روح پر مشتمل ہے اور اگرچہ Nous کا ترجمہ ڈین انج نے دلایلِ قاہرہ پیش کرنے کے بعد روح کیا ہے[5] تاہم چونکہ Nous اور Soul دونوں کے لئے روح کا لفظ استعمال کرنے سے التباس کا خوف تھا لہٰذا میں نے پروفیسر رسل وغیرہ کے تتبع میں Nous کا ترجمہ عقل کیا ہے۔

فلاطینس نے خدا کو خیر بھی کہا ہے باپ بھی اور احد بھی لیکن اس امر کی تصریح بھی کی ہے کہ خدا کے لئے کسی نام کا استعمال بھی صحیح نہیں ہے[6] شاید اسی خیال سے متاثر ہو کر کسی ایرانی صوفی نے یہ شعر نظم کیا ہے ؎

بنام آں کہ او نامے ندارد بہر نامے کہ خواہی سر برآرد

دراصل فلاطینس خدا کے لئے کسی صفتِ ثبوتیہ کا قایل نہیں ہے یہاں تک کہ وہ خدا کو خیر سے بھی بالاتر سمجھتا ہے[7] بلکہ ہر وصف کو بھی ناپسند کرتا ہے اور خدا کو وجود سے بالاتر سمجھتا ہے جو پروفیسر آرم اسٹرانگ کے الفاظ میں نفیِ صفات کی انتہا ہے[8]

فلاطینس خدا کے صفاتِ سلبیہ کا بیان ان الفاظ میں کرتا ہے کہ چونکہ احد کی فطرت کے تقاضے سے تمام اشیا پیدا ہوئی ہیں لہٰذا احد ان اشیاء میں سے خود کوئی شے نہیں ہے یعنی نہ وہ شے ہے نہ صفت نہ مقدار نہ عقل اور نہ روح۔ احد نہ متحرک ہے نہ ساکن نہ مکان

---

1. A History of Western Philosophy Page 308
2. A History of Philosophy By Thilly Page 151
3. A History of Western Philosophy Page 311
4. Plotinus Page 48
5. Mysticism In Religion
6. Plotinus Page 56.
7. Ibid Page 61
8. Ibid Page 31

ہیں ہے نہ زبان میں بلکہ خود بخود موجود ہے اور عجیب و غریب صورت ہے بلکہ بے صورت ہے جو تمام صور حرکت اور سکون سے قبل ہے[1]۔
اور پھر مزید تشریح کے طور پر کہتا ہے کہ جب تم اُسے دماغ یا خدا سے تعبیر کرتے ہو تو وہ حقیقتاً ان دونوں صفتوں سے بالاتر ہوتا ہے اور جب
تم اس کا تصور کرتے ہو تو وہ دراصل اس تصور سے علیحدہ ہوتا ہے۔ وہ جوہر نہیں ہے بلکہ جوہر کو واحد ہونے کے لئے احد کی ضرورت ہے
احد کو خود اپنی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ارسطو کے خدا کے برعکس فلاطینس کا احد نہ عالم ہے نہ جاہل اور نہ خود اپنے خیال میں محو ہے بایں معنی
کہ اگر احد کو خود اپنی ذات کا علم یا خیال ہو تو اس علم یا خیال سے قبل اسے جاہل ماننا پڑے گا لہٰذا احد کو خیال کرنے والی ہستی نہیں بلکہ صرف
ہونا چاہیے[2] اور چونکہ اس کے حضور میں اُس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے لہٰذا اس خیال کو بھی خیال نہیں بلکہ وجدانِ محض کہنا چاہیے[3]
فلاطینس کی نظر میں احد کے لئے یہ کہنا بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ ہے اس لئے کہ اسے اس کی بھی ضرورت نہیں ہے[4]۔ کمال تقدیس کے لئے
فلاطینس نے احد کے لئے ضمیر مذکر کے ساتھ اکثر و بیشتر بے جان ضمیر کا بھی استعمال کیا ہے لیکن اس تنزیہ و تقدیس کے باوجود عالم آخرت
میں نہیں اسی دُنیا میں نہ صرف فلاطینس کے شاگرد پارفری کو ۶۸ برس کی عمر میں وصل بالحق نصیب ہوا بلکہ خود فلاطینس کو بھی پارفری
کے زمانۂ قیام میں چار دفعہ یہ نعمت حاصل ہوئی[5]۔

فلاطینس نے وصل بالحق کی تشریح بھی ہے کی اور اس تشریح سے قبل یہ ہدایت بھی کی ہے کہ چونکہ خدا ظاہر ہونا نہیں چاہتا ہے لہٰذا
اس دنیوی رویت کا حال ان لوگوں سے بیان نہیں کرنا چاہیئے جو دولتِ دیدار سے محروم ہیں[6]۔ فلاطینس کے خیال میں جب انسان کو یہ
معراج حاصل ہوتی ہے تو شاہد و مشہود میں کوئی امتیاز نہیں رہتا[7]۔ بلکہ چونکہ دراصل احد کا مشاہدہ نہیں صرف وصل ہوتا ہے بنابریں
جب ترکِ خیر و شر اور دنیا کی ہر شے سے دل ہٹانے کے بعد عارفِ کامل کی روح اس قابل ہوتی ہے کہ اس دنیا میں بھی دولتِ دیدار
حاصل کر سکے اور چونکہ دراصل نہ کوئی حجاب ہے نہ دوئی اس لئے یہ کہنا چاہیئے کہ جب دفعتاً احد خود اپنے میں ظاہر ہوتا ہے تو پھر جس طرح
اس دنیا میں وصل کی صورت میں عاشق و معشوق میں کوئی فرق نہیں رہتا بالکل اسی طرح انسان اور خدا میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا[8]
فلاطینس کی نظر میں فنا فی اللہ کے علاوہ وصل بالحق کا ایک اور ذریعہ بھی ہے جسے نام نہاد اسلامی تصوف کی اصطلاح میں
فنا فی الرسول کہا جا سکتا ہے یعنی چونکہ احد کی شبیہ عقل احد کے اُس جمالِ مطلق کے نظارے میں محو ہے جس کی ایک ادنیٰ تصویر روح
ہے[9]۔ لہٰذا اگر ہم محسوسات کی دنیا سے غضِ بصر کرنے کے بعد عقلِ اول کے تصور میں محو ہو کر عقلِ اول سے واصل ہو جائیں تو ہم عقلِ اول
کی طرح دولتِ دیدار سے بہرہ ور ہو جائیں گے[10]۔

فلاطینس کے درجِ بالا خیالات سے یہ خیال قایم کرنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ دیوی دیوتاؤں کا قایل نہیں تھا بلکہ جیسا کہ پروفیسر ٹیلی نے

---

[1] Plotinus By Armstrong Page 58
[2] Ibid Page 62
[3] Ibid Page 63
[4] Ibid Page 62
[5] Ibid Page 51
[6] Ibid Page 159
[7] Ibid Page 155
[8] Ibid Page 71
[9] Ibid Page 40

بیان کیا ہے فلاطینس نے کہیں بھی تعدد الٰہ کے عقیدے کی مخالفت نہیں کی ہے اور دیوتاؤں کو مظاہرِ الٰہ تسلیم کیا ہے[1]۔ بیشک پارفری کے قول کے مطابق جب امی لیس نے فلاطینس سے دیوتاؤں کے درشن کے لئے مندر چلنے کے کہا تو فلاطینس نے اُسے یہ جواب دیا کہ مجھے دیوتاؤں کے پاس نہیں جانا چاہئے بلکہ دیوتاؤں کو میرے پاس آنا چاہئے[2]۔ لیکن فلاطینس کے ان الفاظ سے یہ رائے قایم کرنا قطعاً غلط ہوگا۔ کہ اُس کو دیوتاؤں کے وجود سے انکار تھا۔ دراصل فلاطینس کا یہ خیال تھا کہ توفیق الٰہی کے بغیر انسان کی تلاشِ حقیقت بے کار ہے اور باوجودیکہ وہ چند گھنٹے سونے کے علاوہ ہر وقت عقل اول کے ذکرِ خفی میں مشغول رہتا تھا[3]۔ اور اُسے عقلِ اول کے تصور کی وجہ سے دیارِ عقلِ اول میں خود اپنے میں داخل ہوکر حقیقتِ مجردہ کا وصل حاصل ہوچکا تھا[4]۔ تاہم سالکینِ راہِ طریقت کو فلاطینس کی ہدایت یہ تھی کہ ذاتِ احدیت کے پیچھے نہیں پڑنا چاہئے بلکہ جس طرح آنکھ افق پر طلوعِ آفتاب کا انتظار کرتی ہے اور سورج دفعتاً طالع ہوکر آنکھ کو بصارت عطا کرتا ہے بالکل اسی طرح سالک کو آفتابِ جمال الٰہی کے بغتۃً طلوع کا انتظار کرنا چاہئے[5]۔ بنابرایں امی لیس سے انکار کرنے کا مطلب صرف اتنا تھا کہ میرا دیوتاؤں کے درشن کے لئے جانا عبث ہے جب دیوتاؤں کا دل چاہے گا اس وقت وہ خود دیدۂ دل کو اپنے جمال سے منور فرمادیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ خدا، عقل اور روح کی طرح دیوتاؤں کے متعلق بھی فلاطینس کے نظریات واضح نہیں ہیں یعنی کبھی وہ موجودات کے فرقِ مراتب کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اصول اولیں سے قرب کی بنا پر موجودات کے تین درجے ہیں اولاً تصورات جو دیوتا ہیں ثانیاً معقول اشیاء اور ثالثاً غیر معقول اشیاء[6] کبھی فلاطینس ان الفاظ میں ہمہ اوست کا انکار کرتا ہے کہ اگر خدا ہی خدا ہے اور خدا کے علاوہ کوئی اور شے نہیں ہے تو پھر خدا تدبیر کس شے کی کرتا ہے اسلئے یہ کہنا مناسب ہے کہ خدا بعض اشیاء میں ان کو برباد کرنے کے لئے نہیں بلکہ اُن پر حکمرانی کے لئے جلوہ فرما ہوتا ہے مثلاً انسان میں جلوہ فرما ہوکر انسان کو یہ حکم دیتا ہے کہ انسان قوانین الٰہی پر عمل کرے اور یہ وعدہ فرماتا ہے کہ جو شخص قوانینِ الٰہی پر چلے گا اس کی دنیوی زندگی بھی اچھی طرح بسر ہوگی اور اُخروی زندگی بھی اور ان نظریات سے فلاطینس یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ نہ تو کسی کو نجات دہندہ ماننا صحیح ہے اور نہ یہ عقیدہ درست ہے کہ دیوتا اپنی پرسکون زندگی کو چھوڑ کر انسان کے چھوٹے سے چھوٹے کام میں دخل دیتے ہیں[7]۔ اور کبھی یونانی مذاق کے مطابق فلکِ اول اور فلکِ آخر کے ان ستاروں کو "جو کائنات کے گرد باقاعدہ طور سے چکر لگاتے ہیں"۔ دیوتا قرار دیتا ہے[8]۔ اور مندروں میں ان دیوتاؤں کی مورتوں کی یہ توجیہ پیش کی ہے کہ عارف کے نزدیک وصل بالحق ہونے کی حالت میں کسی بُت کی ضرورت نہیں ہے، ہاں اس عالمِ کیف سے باہر بے شک بتوں کو گیان دھیان کے لئے درجۂ دوم کی چیز کہا

---

[1] A History of Philosophy Page 154

[2] Plotinus Page 50

[3] Plotinus Page 49

[4] Plotinus Page 131

[5] Plotinus Page 71

[6] حوالۂ سابق صفحہ ۹۷، نویں صدی ہجری کے صوفی ملا جامی نے بھی لوائح جامی کے لائحۂ ہفتدہم دربست وسوم میں ان مراتبِ وجود کا بیان کیا ہے اور آخر میں یہ مشہور شعر درج کیا ہے ؎ ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد ∴ گر حفظِ مراتب نکنی زندیقی !

[7] "Plotinus" Page 112 پروفیسر آرم اسٹرانگ نے صفحہ ۱۶۷ پر اعتراف کیا ہے کہ بظاہر فلاطینس نے عیسائیوں کے کفارے کے عقیدے پر اعتراض کیا ہے۔

[8] Plotinus Pages 106-10).

جا سکتا ہے اور عقل مند پجاری معموں میں یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ ان شبیہوں سے خدا کا جلوہ کیونکر دیکھا جا سکتا ہے[1]۔

خدا اور عقل اور عقل و روح کا تعلق خود فلاطینس کی نظر میں دیوتاؤں کے وجود سے بھی کہیں زیادہ عسیر الفہم ہے اور وہ اعتراف کرتا ہے کہ فلاسفۂ متقدمین کی طرح ہر انسان کی روح یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہے کہ احد اکیلا کیوں نہیں رہا اس واحد محض سے کوئی شے بھی کیونکر پیدا ہوئی اور اس وحدت میں یہ کثرت کیونکر رونما ہوئی[2]۔

اب تک فلاطینس نے صرف صفات سلبیہ پر زور دیا تھا اور وید مقدس کی نیک نیتی کا ہم نوا ہو کر یہ کہا تھا کہ "ماورائے وجود" بھی خدا کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ خدا یہ نہیں ہے[3]۔ لیکن اب یہ بھول کر کہ خدا کو ایسا کمالِ محض کہا جا چکا ہے جس میں کسی ترقی کی گنجائش نہیں ہے یہ فرض کیا گیا کہ احد جو اس وجہ سے کامل ہے کہ اسے نہ کسی شے کی تلاش ہے نہ کسی شے کی ضرورت ہے اور نہ اس کے پاس کوئی شے ہے اتنا بڑھا کہ گویا چھلک گیا اور اس کے چھلکنے سے جو شے پیدا ہوئی وہ احد ہی کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور احد ہی اسے بھرتا ہے اور پھر وہ احد کی مفکرہ یعنی عقل ہو جاتی ہے[4]۔ اس عقل کی پیدائش کی منطقی دلیل یہ فراموش کر کے کہ خدا پر کوئی شے واجب نہیں ہے اور وہ فعل ہونے کے باوجود کسی کام کرنے کے لئے مجبور نہیں ہے[5] یہ پیش کی گئی ہے کہ جب کوئی شے کمال پر پہونچتی ہے تو وہ خود اپنی ذات میں محدود نہیں رہتی بلکہ دوسری شے پیدا کرتی ہے پھر سب سے زیادہ کامل ہستی خود اپنی ذات میں کیونکر محدود رہ سکتی ہے؟ اور یہ کیونکر سمجھا جا سکتا ہے کہ کمال محض احد کو اپنی ذات سے نفرت ہے اور وہ کچھ پیدا کرنے سے قاصر ہے؟[6]۔ اس عقل کی پیدائش کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح سورج سے شعاع برآمد ہوتی ہے مگر سورج میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، اسی طرح احد سے عقل برآمد ہوتی ہے مگر خود احد میں کوئی تغیر نہیں ہوتا[7]۔

درجِ بالا بیانات سے اس امر کا ایضاح ہوتا ہے کہ خیرِ محض احد عقل سے قبل تھا اور خود فلاطینس نے اقرار کیا ہے کہ خیرِ محض جمال یعنی عقل سے بہت قبل موجود تھا[8]۔ لیکن دوسرے صفحہ پر یہ تصریح بھی کی ہے کہ خیرِ محض یعنی احد جمال یعنی عقل سے زمانے کے لحاظ سے بڑا نہیں ہے بلکہ حقیقت کے اعتبار سے بڑا ہے اور پھر تمام اشیاء کے متعلق یہ نظریہ پیش کر کے کہ "اول یعنی احد کے علاوہ تمام اشیاء کے وجود کا مطلب تخلیق نہیں ہے وہ تو ہمیشہ سے معرضِ وجود میں ہیں اور ہمیشہ رہیں گی ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا منبع احد ہے اور ان کا انحصار احد پر ہے"۔ تمام اشیاء کو بھی عقل کی طرح ازلی ثابت کیا ہے[9]۔

عقل کے متعلق فلاطینس کا یہ خیال ہے کہ جس طرح استعارے کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ زیوس دیوتا کے قریب انصاف تخت نشین ہے اور عقل کی عظمت کی انتہا یہ ہے کہ سب اشیاء عقل کے ساتھ ہیں اور عقل نے سب اشیاء کو بنایا ہے[10]۔ لیکن ناؤس یعنی عقل کو

---

[1] Plotinus Pages 159-60
[2] Plotinus Page 69
[3] Plotinus Page 59
[4] Plotinus Pages 54-55
[5] Plotinus Page
[6] Plotinus Page 68
[7] Plotinus Page 70
[8] Plotinus Page 66
[9] Plotinus Page 53
[10] Plotinus Page 78

افلاطون کے ٹیمیس نامی مکالمہ کے خدا کی طرح ڈیمی ارج یعنی صناع کہنے کے[1] یہ معنی نہیں ہیں کہ عقل نے در اصل تمام چیزیں بنائیں بلکہ حقیقتہً احد سے بھرنے کے بعد عقل سے صرف روح پیدا ہوئی[2] اور جب یہ روح کائنات منتہ تک لبریز ہوگئی تو پھر اس روحِ کائنات کا آخری اور پست ترین اثر محسوسات کی کائنات کی شکل میں ظاہر ہوا اور کل شر کے بغیر نامکمل رہتا لہذا اس دنیا میں شر بھی ہے[3] مگر اس دنیا میں یعنی عقل کے عالمِ مثال میں شر نہیں ہے۔ اس روحِ کائنات کو عقل کی پیداوار سمجھنے کے باوجود فلاطینس نے ان الفاظ میں ازلی کہا ہے "جب انسان کسی مجموعے کو سمجھنا چاہتا ہے تو اس کے اجزاء کا تجزیہ کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں کائنات کے اندر روح نہ ہو یا جسم کے اندر روح نہ ہو یا مادہ منظم شکل میں نہ ہو[4]" حالانکہ ایک دوسرے موقع پر صاف الفاظ میں بتایا جا چکا تھا کہ چونکہ جسم روح کا مکان نہیں ہے لہذا روح کائنات میں نہیں ہے بلکہ کائنات روح میں ہے[5] اور اسی ازلی مادے کے لئے یہ بھی ارشاد ہو چکا تھا کہ مادہ سراب ہے بلکہ عدمِ محض ہے[6]۔

روحِ کائنات کے صفات کے متعلق فلاطینس کے نظریات میں بے حد تضاد ہے یعنی کبھی وہ روحِ کائنات کو ازلی کہتا ہے کبھی عقل کا وجود اس سے قبل مانتا ہے کبھی روحِ کائنات کو عقل کی پیداوار اور محکوم بتاتا ہے، کبھی یہ کہتا ہے کہ روحِ کائنات نہ عقل کے جمال سے متاثر ہوتی ہے نہ اس کے کمال سے بلکہ وہاں سے یعنی احد کی طرف سے بارشِ فیضان ہوتی ہے تو پھر ساکن روح کائنات میں حرکت پیدا ہوتی ہے وہ عقل کے جمال سے متاثر ہو کر دیوانہ وار رقص شروع کرتی ہے اور اس طرح روحِ کائنات ہمہ تن عشق بن جاتی ہے[7] کبھی ہر شے کی شکل احد سے برآمد کی جاتی ہے[8] کبھی عقل سے[9] اور کبھی روحِ کائنات سے[10]۔ کبھی اس روحِ کائنات کو کل کہا جاتا ہے اور عقول و موجودات کو کل فی الکل[11]۔ کبھی یہ بتایا جاتا ہے کہ جو شکل فطرت نے متشکل جسم کو عنایت فرمائی وہ در اصل ایک دوسری شکل ہے اور فطرت سے قطعاً علٰحدہ ہے[12] کبھی یہ فرمایا جاتا ہے کہ کائنات شروع سے آخر تک صور سے لبریز ہے اور چونکہ اس کائنات کی اصل جس کی یہ نقل ہے صورت ہے لہذا یہ کائنات بھی صورت ہے اور چونکہ اسے کل نے بنایا ہے بنا بریں کل بنا ہے اور اس بننے میں کوئی شے مانع نہیں ہو سکتی اور اب بھی اس کل یعنی روحِ کائنات کو کامل قدرت حاصل ہے اور کوئی شے اس کی مانع نہیں ہے۔ اور کبھی اس کلیہ کو نظر انداز فرما کر روحِ کائنات کے علاوہ

---

[1] Plotinus Page 100
[2] Plotinus Page 55
[3] Plotinus Page 100
[4] Plotinus Page 97
[5] Plotinus Page 58
[6] Plotinus Pages 116-117
[7] Plotinus Page 74
[8] Plotinus Page 59
[9] Plotinus Page 78
[10] Plotinus Page 55
[11] Plotinus Page 109
[12] Plotinus Page 104
[13] Plotinus Page 105

کچھ اور خالق پیدا کئے جاتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے "جس طرح درخت سے شاخیں نکلتی ہیں اسی طرح فطرت سے متعدد فطرتیں برآمد ہوتی ہیں۔ عمر کے مختلف ادوار میں مختلف تبدیلیاں ہوتی ہیں مثلاً بلوغ کے بعد مرد کی داڑھی نمودار ہوتی ہے اور نر جانور کے سینگ نکلتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بلوغ کے بعد بلوغ سے پہلے کے عقول فنا ہوگئے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ بلوغ کے بعد کچھ اور عقول کا اضافہ ہوگیا۔ لیکن کیا روح کے یہ عقول صرف خیالات ہیں اور اگر محض خیالات ہیں تو پھر روح صرف خیالات سے اشیاء کیونکر بناتی ہے؟ یہ بدیہی ہے کہ ان عقول کو مادے سے اشیاء بنانا ہوتی ہیں لیکن اگر یہ سچ ہے تو روحِ کائنات کا جزو اعنی مادّے کی روحِ تولید پر اثر انداز ہوتا ہے مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا روح مادّے کی روح تولید کا نشو و نما تعقل کے ذریعہ سے کرتی ہے اور اگر یہ نشو و نما عقل کے ذریعہ سے ہوتا ہے تو کیا یہ تعقل کسی دوسری شے سے حاصل ہوتا ہے یا خود روح میں موجود ہوتا ہے؟ چونکہ یہ نشو و نما روح کا وہ حصّہ کرتا ہے جس میں عقول موجود ہیں لہذا یہ کہنا صحیح ہے کہ روحِ کائنات اشیاء کو بس وہی عطا فرماتی ہے جو اُسے عقل اول کی سرکار سے عطا ہوتا ہے یعنی عقلِ اول روحِ کائنات کو مرحمت فرماتی ہے اور روحِ کائنات ایک دوسری روح کو بذل و عطا سے منور فرماتی ہے اور یہ دوسری روح یعنی فطرت فوراً اشیا بنانا شروع کر دیتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت جو کچھ کر رہی ہے وہ کسی کے حکم کی تعمیل ہے۔ فطرت اچھی چیزوں کو بغیر کسی کی رکاوٹ کے بنا لیتی ہے مگر بری چیزوں کے بنانے میں اُسے مخالفت کا سامنا کرنا ہوتا ہے اور چونکہ فطرت میں صرف حاصل کردہ طاقت ہے اور چونکہ فطرت کے عقول ابتدائی عقول سے مختلف ہیں بنابرایں فطرت محض صور کو پیش نظر رکھ کر اشیاء نہیں بناتی بلکہ کچھ حصہ اپنا بھی شامل کر دیتی ہے اور یہی شر ہے۔ فطرت کی بنائی ہوئی خراب چیزیں زندہ تو ضرور ہیں مگر نہایت ناقص ہیں جن سے خود فطرت کی زندگی عذاب بن کر رہ جاتی ہے اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ بُری چیزیں اولین حقایق کی تلچھٹ ہیں اور نہایت ادنیٰ قسم کے مادّے سے بنائی گئی ہیں۔ آفاقی کُل میں ادنیٰ ترین روح یعنی فطرت کا بس یہی حصّہ ہے[1]"

فلاطینس کے مابعد الطبیعیاتی تصورات کی طرح اس کے عملی نظریات میں بے انتہا تضاد ہے۔ فلاطینس احد کو عقل سے نہیں بلکہ وجدان سے سمجھنے کا قایل ہے اور اس وجدان کا اہل وہ تین طرح کے آدمیوں کو سمجھتا ہے اولاً موسیقی کے دلدادہ انسان جو سماع کے ذریعہ سے جمالیات کو سمجھ سکیں ثانیاً عشاق جو عشق مجازی کے ذریعہ سے عشقِ حقیقی کی منزل تک پہونچ سکیں اور ثالثاً فلاسفہ جو منطق کے ذریعہ سے نہیں بلکہ برہانیات اور علم الحساب کے ذریعہ سے حقیقت کو سمجھ سکیں[2]۔ فلاطینس کی نظر میں کبھی تو من عرف نفسہ فقد عرف ربّہ کے تحت خود اپنے کو سمجھ لینا اپنی روح کو احد کی تصویر بنا لینا ہے[3]۔ کبھی خود فلاطینس کی طرح ہر وقت عقل اول کے مراقبے میں مشغول رہنا عقل اول کی طرح بادشاہِ کائنات بن جانا ہے[4] اور کبھی ترکِ خیر و شر بلکہ ترکِ ترک کے بعد خدا کے جمال کا نظارہ کرنا ہی سب کچھ ہے۔ یعنی فلاطینس کے الفاظ میں "جب روح دفعتاً منور ہو جائے تو تم سمجھ لو کہ تمھیں خدا کا دیدار حاصل ہوگیا اس لئے کہ یہ نور اسی کی طرف سے پیدا ہوا بلکہ وہ خود نور ہے لہذا جس روح نے خدا کو نہیں دیکھا وہ ظلمات میں ہے[5]" اس دولتِ لازوال کے حصول کے لئے کبھی تو رہبانیت کی یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جو زندگی روح کے ساتھ جسم کے ضرورت سے زیادہ خیال کرنے میں بسر ہوتی ہے وہ ہرگز ہرگز اچھی زندگی نہیں کہی جا سکتی اور افلاطون کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ جو شخص بھی عقل مند اور انجام میں مسرور بننا چاہتا ہے،

---

[1] Plotinus Pages 98-100
[2] Plotinus Pages 137-38
[3] Plotinus Page 160
[4] Plotinus Page 92
[5] Plotinus Page 154

اس کے لئے لازم ہے کہ اس دنیوی زندگی پر وہاں کی یعنی عالمِ بالا کی زندگی کو ترجیح دے اور خیرِ محض یعنی خدا کے تصور میں محو رہے اور خدا ہی کی طرح بننے کی کوشش کرے[1] اور اسی سلسلہ میں یہ بتایا گیا کہ صرف مراقبہ کافی نہیں ہے بلکہ انسان کو دیدارِ الٰہی کے حصول کے لئے خیر و شر بلکہ کائنات کی ہر شے سے دست بردار ہو جانا چاہئے[2] اور کبھی ان تعلیمات سے صرفِ نظر کرنے کے بعد ناسٹک فرقہ کے عیسائیوں کی رہبانیت کو محلِ اعتراض بنایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کوئی صاحب ہوش انسان اس کائنات کی خوبی کے متعلق شک کر ہی نہیں سکتا ہاں جو شخص بصارت اور بصیرت دونوں سے محروم ہے وہ اس طرح کا بے تکا سوال پوچھ سکتا ہے کہ کائنات میں کیا خوبی ہے؟ ان مستفسرین کا حال اس مثال سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ ایک عالی شان محل میں دو آدمی رہتے ہیں ایک ہر وقت محل اور محل کے بنانے والے پر اعتراض کرتا رہتا ہے لیکن ان اعتراضات کے باوجود محل سے باہر نہیں جاتا اور دوسرا محل کو بھی اچھا سمجھتا ہے اور محل کے بنانے والے کو بھی اور ہنسی خوشی کے ساتھ اس وقت کا انتظار کرتا ہے جب ان دونوں کو کسی گھر کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ممکن ہے کہ پہلا آدمی یعنی معترض اپنے دل میں یہ سمجھے کہ چونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ اس محل کی تعمیر میں بے روح پتھر اور لکڑی سے کام لیا گیا ہے اور چونکہ اُسے علم ہے کہ اس عارضی رہائش گاہ سے دائمی اقامت گاہ یقیناً بہتر ہے لہٰذا وہ دوسرے آدمی کے مقابلہ میں اس محل سے رخصت ہونے کے لئے زیادہ خوشی سے آمادہ رہے گا لیکن یہ اس معترض کی غلط فہمی ہے اور حقیقتاً یا تو یہ معترض اس محل میں مقیم رہنے کے باوجود صرف اس لئے اعتراض کرتا ہے کہ جو کچھ اسے طوعاً و کرہاً برداشت کرنا ہے اُس کی برداشت کی قوت اس معترض میں نہیں ہے اور یا پھر یہ معترض زبان سے تو اعتراض کرتا ہے مگر دل سے اس محل کی محبت میں گرفتار ہے اصل یہ ہے کہ جب تک ہمارا جسم باقی ہے ہمیں اس محل میں قیام کرنا ہے[3]۔ اس سلسلہ میں فلاطینس نے یہ بھی کہا ہے کہ جس طرح ایسے مغنی کا وجود ممتنع ہے جو "نغمۂ الست" سے تو مست ہو لیکن اس محسوسات کی دنیا کی سنائی دینے والی موسیقی سے متاثر نہ ہو اسی طرح ایسے تارک الدنیا راہب کا وجود بھی محال ہے جو عالمِ مثال کی نہ دکھائی دینے والی چیزوں کے جمال پر تو فریفتہ ہو مگر اس دنیا کی دکھائی دینے والی خوبصورتی سے متاثر نہ ہو[4]۔ الغرض فلاطینس کا یہ عجیب و غریب اور متضاد فلسفہ ایک ایسا "مائدۂ لذتِ درد" ہے جس سے "بقدرِ لب و دنداں" فلاسفہ کا کام بھی نکلا و یہودانیتوں کا بھی اور صوفیہ کے اصحاب صحو و سکر کا بھی۔

۲۷۰ء میں فلاطینس کا انتقال ہو گیا اور پارفری (۳۰۴-۲۳۲ء) اُس کا جانشین ہوا[5] اور اگرچہ خود فلاطینس نجوم کا بھی قایل تھا، شگون کا بھی، تفاؤل کا بھی اور جادو کا بھی[6] تاہم پارفری ان توہمات پر یقین رہبانیت پر ایمان اور یونانی مذہب پر ایقان کے بارے میں فلاطینس سے کہیں بڑھا ہوا تھا اور اسی وجہ پارفری نے ارواحِ خبیثہ کے وجود۔ پیش بینی، بُت پرستی، جادو اور عمل کو حق سمجھ لیا تھا[7]۔

تعجب ہے کہ درج بالا حقایق کے باوجود پروفیسر وبر نے نو افلاطونیت میں توہمات کے شیوع کا زمانہ چوتھی صدی عیسوی کے

---

[1] Plotinus Page 143
[2] Plotinus Page 155
[3] Plotinus Pages 144-45
[4] Plotinus Page 144
[5] History of Western Philosophy Weber p. 139
[6] Plotinus Pages 107-111
[7] A History of Philosophy By Thilly p. 155

اواخر کو قرار دیا اور پارفری اور فلاطینس کو توہمات کا شدید ترین مخالف سمجھا۔[1] بظاہر پروفیسر وبیر نے نہ فلاطینس کے فلسفہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور نہ شیاطین کے وجود کے متعلق پارفری کا خط موصوف کی نظر سے گزرا۔ پارفری کے بعد شامی مدرسۂ فلسفہ کے ایک مفکر ائمبلیکوس کا نام نوافلاطونیت کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ائمبلیکوس نوفیثاغورثی بھی تھا اور نوافلاطونی بھی اور اس کا خاص کارنامہ یہ تھا کہ فلسفہ کی رو سے یونانی مذہب کو مطابقِ عقل ثابت کیا۔ مشہور رومن شہنشاہ جولین جس نے اپنی دو سالہ حکومت (۳۶۱-۳۶۳ء) کے دور میں عیسائی مذہب کے بجائے یونانی مذہب رائج کرنا چاہا تھا اور جسے عیسائی مورخین مرتد کے لقب سے یاد کرتے ہیں، اسی نے ائمبلیکوس کا پیرو تھا۔[2] ائمبلیکوس کا انتقال ۳۳۰ء میں ہوا۔

ائمبلیکوس کے انتقال کے بعد یعنی چوتھی صدی عیسوی کے نصف آخر میں ادھر تو قسطنطنیہ میں تھیمس ٹیس، ائمبلیکوس کی تقلید میں افلاطون اور ارسطو کے متضاد فلسفہ کو ایک کرنے کی کوشش کر رہا تھا ادھر ایتھنز کی افلاطونی اکادمی اس فلسفہ میں ائمبلیکوس کی مذہبی تعلیم شامل کر رہی تھی اور ادھر پانچویں صدی عیسوی کے اوایل میں اکادمی کے رکن پروکلس نے نوافلاطونیت کو باقاعدہ طور سے اکادمی میں رائج کر دیا تھا اور ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۵۲۹ء میں عیسائی رومن شہنشاہ جسٹی نی ان کے حکم سے مدرسۂ فلسفہ بند ہونے تک جو فلسفہ رائج تھا اس میں ائمبلیکوس کے دینیات اور توہمات بھی شامل تھے اور ڈاکٹر دیہلم نیسل کے الفاظ میں "یہی نقش اس عیسوی اور اسلامی فلسفہ میں بھی نظر آتا ہے جو اس تعلیم سے پیدا ہوا"[3] بلکہ جہاں تک عصرِ حاضر کا تعلق ہے آج بھی تصورِ الٰہ میں نوافلاطونیت کی طرح فلسفہ بھی شامل ہے اور مذہب بھی۔[4]

(باقی)

---

[1] History of Philosophy By Weber p. 139
[2] A History of Philosophy By Thilly p. 155
[3] "مختصر تاریخ فلسفۂ یونان" صفحہ ۲۸۹
[4] A History of Philosophy By Thilly p. 135

گلہائے پریشاں

آراستہ الیاس احمد (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج)

ضخامت کتاب ۵۰۸ صفحات۔ تقطیع بڑی قیمت سات روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ :- کتابستان - الہ آباد

"گلہائے پریشاں" فارسی اور اردو شعراء کے چوٹی کے کلام کا بے مثل گلدستہ ہے، آغازِ عشق سے انجامِ عشق تک جتنے مراحل پیش آتے ہیں اُنکے متعلق سُرخیاں قایم کی گئی اور چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ہر سرخی کے تحت میں تقدم و تاخر کے لحاظ سے درج ہیں۔ مراحل محبت کی سرخیوں کے علاوہ خمریات، مذہبیات، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق بھی سُرخیاں قایم کی گئی ہیں۔ اگر کسی شعر کے متعلق کوئی لطیفہ درج ہے۔ اساتذۂ سابق کی تیس تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں۔

اُردو ادب میں یہ کتاب ایک دلکش و دلفریب اضافہ ہے اہلِ ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

مومنؔ کا تغزل

بہ سلسلۂ ماہ مئی ۱۹۵۸ء

(ڈاکٹر) عبادتؔ بریلوی

مومن نے حسن و عشق کی محدود دنیا میں رہ کر اس کے متعلق ان گنت باتیں کہی ہیں اور ان میں سے ہر بات اپنے خلوص اور صداقت، اپنی اصلیت اور واقفیت، اپنی جدت اور اچھوتے پن، اپنی گیرائی اور گہرائی کے باعث قدم قدم پر دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مومنؔ نے ان تمام باتوں کو آسمانی اور ماورائی نہیں بنایا ہے وہ اسی زمین کی باتیں ہیں۔ اسی لئے وہ عجیب اور نامانوس نہیں معلوم ہوتیں، مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ وہی باتیں ہیں جو اُردو غزل کے آغاز سے موجودہ زمانے تک تقریباً تمام غزل گو شعراء کے ہاتھوں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ کم و بیش ہر غزل گو شاعر کچھ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا ہے۔ وہی انسانی حسن کا بیان، وہی اس حسن سے والہانہ جذب و شوق کا اظہار، وہی اس سے ایک مجنونانہ شیفتگی اور والہانہ دلبستگی — اور اس شیفتگی اور دلبستگی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ان گنت واقعات وصل کی تمنا، ہجر و فراق کی کڑھن، رشک، رقیب، نامہ بر، ناصح، پاسبان، اور اس سلسلہ کی ساری تفصیل، وہی جو حسن و عشق کی دُنیا میں ہوتا ہے، وہی جس کو تمام غزل گو شاعر اب تک پیش کرتے آئے ہیں۔ مومنؔ نے بھی انھیں باتوں کو پیش کیا ہے لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان روایتی موضوعات کو پیش کرنے کے باوجود، مومنؔ ان سب سے مختلف نظر آتے ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ مومنؔ نے کبھی بھی روایتی ہونا پسند نہیں کیا۔ اسی لئے ان کے تغزل میں یہ موضوعات صرف رسمی اور روایتی انداز میں نہیں ملتے۔ وہ تو ان کے اپنے ذاتی تجربات ہیں جن میں نجی آہنگ ہر جگہ ایک نئی دنیا کو پیدا کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے ایک بات یہ بھی ہے کہ مومنؔ نے غزل کی روایت سے دلبستگی کے باوجود ان کو پیش کرنے میں غزل کے عام اشاروں اور کنایوں سے بہت کام لیا ہے۔ ان کے یہاں گل و بلبل، شمع و پروانہ کوہکن و شیریں، قیس و لیلےٰ اور طور و موسیٰ کے پردوں میں حسن و عشق کے معاملات کی ترجمانی نہیں ملتی۔ مومنؔ کا تغزل ان کے احسان سے زیر بار نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات کو ان کے سہارے کے بغیر پیش کیا ہے۔ اس لئے ان کی غزل اپنے پیشروؤں اور ہم عصروں سے اتنی مختلف نظر آتی ہے۔ اس سہارا نہ لینے کا یہ نتیجہ ہے کہ مومنؔ کو اظہار کے لئے نئے راستے نکالنے پڑے ہیں۔ ابلاغ کی نئی دنیا میں پیدا کرنی پڑی ہیں۔ اس لئے ان کے تغزل میں اسلوب کا ایک انداز اور طرزِ ادا کا ایک نیا آہنگ ملتا ہے۔ لیکن یہ تو ایک الگ بحث ہے یہاں تو صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ مومنؔ کے انفرادی تجربات اور ذاتی احساسات نے ان کے موضوعات کو روایتی ہونے سے بچایا اور ایسا کرنے میں انھیں اظہار و بیان کی ایسی راہیں نکالنی پڑیں، جنھوں نے ان کی غزلوں کی دُنیا ہی بدل دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی اور عکاسی میں ایک نئی اور اچھوتی فضا کا احساس ہوتا ہے۔

غزلوں کی ایک نئی اور اچھوتی فضا میں جو چیز مومنؔ کے یہاں سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ مومنؔ کا صد درجہ بڑھا ہوا لطیف احساس جمال ہے۔ اس لطیف احساس جمال نے حسن کے ان گنت روپ مومنؔ کی غزلوں میں بے نقاب کئے ہیں۔ بنیاد تو ان سب کی ایک ہی ہے۔ یعنی انسانی حسن۔ لیکن اس انسانی حسن میں نہ جانے کیا کیا کچھ مومنؔ نے دیکھا اور دکھایا ہے۔ اپنے شدید احساس اور بلند تخیل کے سہارے وہ اس سلسلہ میں ایسے مقامات پر بھی پہونچتے ہیں جہاں ہر شخص کا پہونچنا آسان نہیں ہوتا۔ اسی لئے حسن اور

اُس کی تمام جلوہ سامانیاں، مومن کے تغزل میں ایک ایسی رنگینی پیدا کرتی ہیں جس میں لطیف ذوق جمال رکھنے والے کا کھو جانا یقینی ہے مومن نے اس حسن کو جسم میں بھی دیکھا ہے، چال ڈھال میں بھی دیکھا ہے، آواز میں بھی دیکھا ہے، لباس میں دیکھا ہے۔ غرض کوئی پہلو بھی ان کی نگاہ سے بچا نہیں ہے۔ وہ ان سب کے والہ و شیدا رہے ہیں جہاں بھی ان کی نظروں کے سامنے اس حسن کا کوئی پہلو آیا ہے وہ اس میں ڈوب گئے ہیں اور اس طرح اس کی تصویر کھینچی ہے کہ اس کا جواب نہیں۔ اس میں کچھ تو حسن کے اس پہلو کو دخل ہوتا ہے جس کو مومن پیش کرنا چاہتے ہیں، اور کچھ مومن کا رنگین اور پرکار تخیل بھی اس میں حسن کی بجلیاں بھر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کی کھینچی ہوئی حسن کے مختلف پہلوؤں کی یہ تصویریں منہ سے بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ان اشعار میں حسن کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کیسے دل موہ لینے والے انداز میں کی گئی ہے :-

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں ۔۔۔ بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں

پھر پیرہن کے ہوتے ہیں ٹکڑے بہ رنگ گل ۔۔۔ پھر مجھ کو آگئی کسی گل پیرہن کی یاد

پھر دل ہے داغ مطلع خورشید دیکھ کر ۔۔۔ زیبس کہ یاد جلوۂ بالائے بام ہے

بادِ بہار میں ہے کچھ اور عطر بیزی ۔۔۔ تم آج کل میں شاید سوئے چمن گئے ہو

اس حسن پہ خلوت نے جو حال کیا کم تھا ۔۔۔ کیا جائیے کیا کرتا گر تو مری جا ہوتا

دیکھے ہے چاندنی وہ زمیں پر نہ گر پڑے ۔۔۔ اے چرخ اپنے تو مہ کامل کو تھامنا

چلنا تو دیکھنا کہ قیامت میں بھی قدم ۔۔۔ طرزِ خرام و شوخی رفتار کے لئے

اب شور ہے مثال جو دی اس خرام کو ۔۔۔ یوں، کون جانتا تھا قیامت کے نام کو

ہوتے ہیں پائمال گل اے بادِ نوبہار ۔۔۔ کس سے اُڑائی تو نے یہ رفتار کی طرح

اُس بت کی ابتدائے جوانی مراد ہے ۔۔۔ مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

نکہت اُس زلف کی صبا میں نہ ہو ۔۔۔ اُڑ گیا رنگ بوئے سنبل کا

ہر دم عرق عرق نگہ بے حجاب ہے ۔۔۔ کس نے نگاہ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ

اعجاز سے زیادہ ہے سحر اُس کے ناز کا ۔۔۔ آنکھیں جو کہہ رہی ہیں وہ لب سے بیاں نہ ہو

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو ۔۔۔ ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

کیونکہ نہ آدھی آدھی رات جاگے وہ جس کا دھیان ہو ۔۔۔ آ ہوئے نیم خواب میں نرگسِ نیم باز میں

یہاں ہے چاک گریباں تو واں بھی چستی ہے ۔۔۔ قبائے شوخ شمائل کے ٹکڑے ٹکڑے میں

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی ۔۔۔ قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک ۔۔۔ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

دشنام یار طبع حزیں پہ گراں نہیں ۔۔۔ اے ہمنفس! نزاکت آواز دیکھنا

دشمنی دیکھو کہ تا اُلفت نہ آجائے کہیں ۔۔۔ لے لیا منہ پر دوپٹہ حال میرا دیکھ کر

دیکھتے ہی گل نظر میں تیرا ہنسنا پھر گیا ۔۔۔ آتش گل نے لگائی آگ اے گل رو ہمیں

"مومن صورت پرست" نے حسن اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بیان میں یہاں صرف صورت پرستی ہی کو اپنے پیش نظر نہیں رکھا ہے۔ وہ اس دائرے سے باہر نکلے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کہیں یہ حسن انھیں جلوۂ بالائے بام میں نظر آتا ہے۔ کہیں وہ آپ عالم خلوت میں دیکھتے ہیں۔ کہیں کسی کی گل پیرہنی انھیں متاثر کرتی ہے۔ کہیں طرز خرام اور شوخی رفتار کا سحر انھیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

کہیں کسی بت کی ابتدائے جوانی میں انھیں قیامت نظر آتی ہے - کہیں نگہ بے حجاب انھیں دنیا سے بے خبر کر دیتی ہے - کہیں آنکھوں سے ٹپکتی ہوئی حیا کا انداز انھیں مبہوت کر دیتا ہے کہیں کہیں آہوئے نیم خواب اور نگاہ نیم باز کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں کہیں کسی غیرت ناہید کی ہر تان پر انھیں دیپک کا گمان گزرتا ہے، کہیں دشنام یار میں وہ صرف نزاکت آواز کو دیکھتے ہیں - غرض یہ اور اسی قسم کے بے شمار پہلوؤں سے ان کا احساس جمال متاثر کرتا ہے - مومن اس حسن کی تلاش میں خدا جانے کہاں سے کہاں جا نکلتے ہیں ان کی نظریں اس کی تلاش و جستجو میں نہ جانے کہاں کہاں پہونچتی ہیں - لیکن اس تلاش و جستجو میں ہر جگہ اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ مومن کہیں بھی حسن کے ان مظاہر کو تمام تر خارجی زاویۂ نظر سے نہیں دیکھتے - اُن کی نگاہ شباب اس میں ہمیشہ شامل رہتی ہے - اسی لئے مومن کے یہاں حسن کے بیان میں محسوساتی زاویۂ نظر زیادہ ملتا ہے - محسوسات ہی کے سہارے ان کے بیان میں زیادہ رچاؤ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے - رنگینی اور رعنائی کا وجود ہوتا ہے اور لطافت و نفاست کے عناصر نمایاں ہوتے ہیں - یہ صورت پیدا نہ ہو تو حسن کے محض خارجی بیان میں سستا پن آجاتا ہے - ایک سطحیت نمایاں ہونے لگتی ہے اور اکثر اوقات تو بڑے بڑوں کے یہاں اس کی حدیں ابتذال سے جا ملتی ہیں - مومن اس دلدل میں پھنسنے سے بچے رہے ہیں - اسی لئے ان کے یہاں حسن بیان میں ستھرا پن ملتا ہے اور لطافت و نفاست نظر آتی ہے -

مومن کے تغزل میں احساسِ حسن، حسن پرستی ہی تک محدود نہیں ہے - وہ عشق کی پہلی منزل ہے - بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں - انھیں ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا - حسن اُن کے یہاں عشق کا محرک ہوا ہے اور عشق نے اس حسن میں رعنائی پیدا کی ہے - اس کو صحیح معنوں میں حسن بنایا ہے - ورنہ ظاہر ہے حسن و عشق کی نگاہ شباب کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتا - مومن نے حسن سے عشق اور عشق سے حسن کے چراغ جلائے ہیں، اور اس طرح اپنے تغزل میں دونوں سے چراغاں کیا ہے - اسی کی تفصیل ان کی غزلوں میں ملتی ہے -

اس میں کیفیات اور معاملات عشق کی ترجمانی کو نمایاں جگہ حاصل ہے لیکن یہ ترجمانی، مومن کے یہاں خیالی اور تصوری نہیں ہے اس میں جگہ جگہ حقیقت اور واقعیت کی ایسی جھلکیاں نظر آتی ہیں، جن پر اُردو تغزل کی روایت فخر کر سکتی ہے - اس کا سبب یہ ہے کہ اس میں مومن نے جو کچھ بھی پیش کیا ہے وہ اُن کے ذاتی تجربات ہیں - ان تجربات ہی نے ان کے تغزل میں حقیقت کا خون دوڑایا ہے اور واقفیت کی گرمی پیدا کی ہے مومن نے خود عشق کیا ہے - وہ ساری زندگی اس کوچہ کی خاک چھانتے رہے ہیں - خود اُن کے کلام میں اس کے ثبوت موجود ہیں - اُن کا ایک عشق تو بہت ہی مشہور ہے، جن کا تذکرہ اُن کے بعض ہمعصر تذکرہ نویسوں نے بھی کیا ہے - نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے 'گلشن بیخار' میں مومن کے تذکرے میں تو اس کا ذکر نہیں کیا لیکن امتہ الفاطمہ بیگم صاحب کے تذکرے میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے - لکھتے ہیں :-

"نام امتہ الفاطمہ بیگم معروف بہ صاحب جی بتقریب مداوا با مومن خاں کاوش افتادہ است چند کارروبا مدرد و دوا بود - مثنوی قول غمیں، کہ از خان معزے الیہ است شرح نسخہ نام - حسن و جمال ہماں موزوں تر است"[1]

کریم الدین نے بھی طبقات الشعراء میں صاحب پر لکھتے ہوئے اس واقعہ کی تفصیل ان الفاظ میں پیش کی ہے :-

"صاحب ایک عورت مسماۃ امتہ الفاطمہ بیگم، جس کو صاحب بھی کہتے ہیں درمیان شاہجہاں آباد کے حکیم مومن خاں سے ملاقات اس کی بہ تقریب علاج کے ہوئی تھی - مدت تک آشنائی رہی - کئی سال گزرے کہ لکھنؤ چلی گئی ہے - وہ ایک غانگی تھی - مثنوی قول غمیں مومن کی اس محبوبہ کے حق میں ہے - باسبب فیض صحبت مومن خاں صاحب کے وہ بھی شعر کہنے لگی تھی"[2]

---

[1] شیفتہ :- گلشن بیخار - [2] کریم الدین :- طبقات الشعراء - صفحہ ۳۷۱

مومن کے ہم عصر تذکرہ نویسوں کے ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے عشق کی کوچہ گردی کی۔ یہ تو خیر ایک عشق تھا۔ ایسے عشق تو مومن نے جانے کتنے کئے ہوں گے۔ مومن جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اس کی دنیا میں ایسے عشق عام تھے۔ امراء رؤسا کی زندگی کا یہ ایک پہلو تھا۔ اس کاروبار شوق کے گھر گھر چرچے تھے۔ مومن کا تعلق اس طبقے سے تھا انھوں نے آنکھ کھولتے ہی اپنے آس پاس اور گرد و پیش اس عشق اور کاروبار شوق کی گرم بازاری دیکھی، ماحول کا اثر انسان پر بڑا گہرا ہوتا ہے، اس لئے مومن، باوجود اپنی گہری مذہبیت کے اس سے دامن نہ بچا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں ان کے ماحول کے اثر کو بہت دخل تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مومن اپنے سینے میں ایک انسان کا دل رکھتے تھے۔ اس لئے عشق و عاشقی کی دنیا میں انھوں نے جو قدم رکھا ہے، اس میں ان کی انسانیت بھی برابر کی شریک ہے۔ انھوں نے ایک انسان کی طرح کاروبار شوق سے دلچسپی لی ہے لیکن وہ انسانیت کے دائرے سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ اسی لئے عشق مومن کے یہاں ہنگامے سے کہیں زیادہ ایک تہذیب کا نام ہے۔ وہ ہیجان نہیں پیدا کرتا۔ سنوارتا اور نکھارتا ہے۔ اسی میں اس کے انسانی ہونے کا راز ہے۔

عشق کا یہ انسانی آہنگ مومن کی غزلوں میں بہت نمایاں ہے اور اس حد تک نمایاں ہے کہ اس نے طبقاتی مزاج کو پس منظر میں ڈال دیا ہے۔ مومن کے مقابلہ میں غالب کے تغزل میں اس طبقاتی مزاج کا غلبہ ہے۔ یہاں تک کہ غالب کی انسانیت کہیں کہیں اس کے نیچے دب گئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حجاب پس وضع اور غرور عز و ناز میں برسر پیکار رہنے والی کیفیت ان کے یہاں رونما نہ ہوتی۔ مومن کے یہاں طبقاتی احساس تو ہے لیکن ان کی انسانیت نے اس احساس میں لچک پیدا کر دی ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں عشقیہ معاملات کی ترجمانی میں اس پندار اور غرور کا پتہ نہیں چلتا جو غالب کے ساتھ مخصوص ہے۔ مومن اس سطح سے ذرا نیچے اترے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں محبوب کو نظر انداز کر دینے کا احساس نہیں ہوتا۔ لذت کا خیال ان کے تغزل میں ضرور ہے، لیکن طبقاتی احساس کے دب جانے کے باعث یہ نوبت نہیں آتی کہ لذت کا خیال تعیش کی سرحدوں میں داخل ہو جائے۔ وہ انسانیت کے حدود میں رہتا ہے۔ مومن کے تغزل میں لذت کا یہ خیال یوں تو پوری شدت کے ساتھ موجود ہے لیکن وہ درحقیقت انسان کے جذباتی اور جسمانی تقاضوں کی تکمیل کا نام ہے۔ ان کی غزلوں میں اس پہلو سے متعلق جتنے خیالات بھی ملتے ہیں ان سب میں ایک توازن کا احساس ہوتا ہے ایک ذہنی اور جذباتی صحت مندی نظر آتی ہے۔ مومن کے یہاں جسمانی اور جذباتی دنیا کے جتنے بھی مراحل ہیں، ان سب کی تفصیل موجود ہے۔ لیکن کہیں بھی وہ ان کو پیش کرتے ہوئے بہکے نہیں ہیں۔ کہیں بھی ان سے لغزش نہیں ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مومن کے عشق کی نوعیت تمام جسمانی اور جذباتی ہے لیکن انھوں نے اس سلسلہ کے مختلف معاملات کو پیش کرتے ہوئے کہیں بھی کسی انتہا پسندی سے کام نہیں لیا ہے۔ وہ کسی ذہنی الجھن کے شکار نہیں معلوم ہوتے۔ ان کی لذت پسندی کی حدیں تعیش سے ضرور ملتی ہیں لیکن اس کے ہاتھوں اکتساب لذت کی صحت مندی کا خون نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ ابتذال سے دور رہتے ہیں اور لایعنی باتوں کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔ اسی لئے تو ان کے تغزل میں ایک عام صحت مند انسان کے معاملات اور اس کی واردات و کیفیات کی ترجمانی ہر جگہ ملتی ہے۔ انکا تغزل اسی خصوصیت سے پہچانا جاتا ہے۔ (باقی)

معراج العاشقین

(اردو کی اولین تصنیف)

"گوپی چند نارنگ نے اسے بڑے سلیقے سے شایع کیا ہے، اور مقدمہ میں مصنف و تصنیف دونوں پر بڑی واضح روشنی ڈالی ہے۔" (علامہ نیاز فتحپوری)

آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی ۶ سے، صرف بارہ آنے میں طلب فرمائیے

اب سے پچاس سال پہلے

جب آتش جواں تھا

(چند دن حُسن آباد بمبئی میں)

(نیاز فتحپوری)

"رُخ تماشہ گہہ نازآورم"

.....ء

آج صبح ہی سے ایک خاص قسم کی خستگی محسوس کر رہا ہوں، جسم کی نہیں روح کی۔ موسم کا تقاضا ہے کہ بسنت کی حسین دیوی کے شگفتہ قہقہوں کا لطف اُٹھاؤں۔ اس کے زرد آنچل کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھ کر اس کا تعاقب کروں اور گزر جانے والے موسم سرما کی تمام غیر شاعرانہ کیفیات کو محو کر کے بہار کی دیوی نزاکتوں اور رعنائیوں کی حضور میں تجدید محبت کروں، اور اس سے بھی زیادہ وہ کروں جس کی ترغیب میں خیام کا یہ مصرع پیش کیا جاتا ہے :-

زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

کیونکہ جب فضا رنگ و بو سے بھر جائے، ہوا جب چنگ و رباب چھیڑنے لگے جسے صرف دل ہی سن سکتا ہے تو دنیا بھی عبیر و گلال ہی سے کھیلنا پسند کرتی ہے، اس کا بھی یہی جی چاہتا ہے کہ اپنے اندر اہتزاز رقص پیدا کرے، لیکن یہ بات نہ کہنے کی ہے نہ سننے کی کہ ایک حزین روح بھی نہایت نازک دیوی ہے، طبیعت کا ملال بھی ایک خاص رنگ رکھتا ہے اور ٹوٹے ہوئے دل کی صدا بھی ایک مستقل نغمہ و سرود ہے۔

دُنیا کی آبادی بہ لحاظ احساس دو قابل ذکر جماعتوں میں منقسم ہے۔ ایک طربیہ یا متفاءل (Optimistic) جو فلسفۂ خیام کی مقلد ہے اور وعدۂ فردا پر لذت امروز کو قربان کرنا پسند نہیں کرتی۔ دوسری حُزنیہ یا متشائم (Pessemistic) جو ہر بات کے ملول و حزیں رُخ کو سامنے رکھ کر نشاطِ حاضر کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے، وہ پھول کو دیکھ کر قہقہہ و خندہ سے تعبیر کرتی ہے یہ اُسے صرف ایک زخم سمجھتی ہے وہ نسیم کو زمزمۂ محبت خیال کرتی ہے اور یہ اس کو صرف آہ جانتی ہے۔ ایک ایرانی ادیب، عباس شاہ صفوی کے باغ کی تعریف کرتا ہوا صبح و شفق کی تعبیر ایک نہایت ہی لطیف مگر طربیہ استعارہ کی صورت میں اس طرح کرتا ہے کہ :-

صبح نسیمے ست از نسترن زارش گزشتہ ، و شفق ہوائے ست از لالہ زارش برگشتہ

لیکن اسی منظر کے متعلق دوسری جماعت کے ادیب سے پوچھو تو وہ صبح کو "چہرۂ پریدہ رنگ" اور شفق کو "دامن خونیں زیر سنگ" کہے گا عالم وجود یکسر مناظر و مرایا سے مرکب ہے اور یہ وہ نشانات باطلہ ہیں جن کی تعبیر ہر شخص اپنے ذہن و تصور کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ کر سکتا ہے۔ آگ روشن ہو کر چاروں طرف کی فضا کو منور کر دیتا ہے، ایتھر وہی ہے لیکن شعلہ کا انعکاس اسے رنگین بنائے ہوئے ہے۔ سطحی نگاہ سے دیکھنے والے کہہ سکتے ہیں کہ ہوا رنگین ہے، حالانکہ رنگ ہوا میں کہاں، شفق چہرۂ آفتاب کا صرف آئینہ ہے، لیکن دُنیا نے اس کا ایک علیحدہ نام رکھ دیا — یہی وہ اثرات تھے جن کی بنا پہ بیدل یہ کہنے پر مجبور ہو گیا

بیدل آں گوہر نایاب مُراغ — بہ محیطے ست کہ پرسیدن نیست

عکس افتادہ در آئینۂ ہوش — گل تواں گفت و لے چیدن نیست

میں انھیں خیالات میں محو تھا کہ میرے ایک گم گشتہ دوست کی تحریر دوپہر کی ڈاک سے موصول ہوئی، لکھا تھا :-

"بمبئی آیئے، اور اس چیز کو جسے آپ نے فتحپور کی ویرانیوں میں گم کیا تھا، ساحل قلابہ پر ڈھونڈھ لیجئے — جس وقت آخری بار میں آپ سے ملا تھا اس کے بعد سے دنیا کے ساتھ میں بھی اب بقدر دس سال ضعیف ہو گیا ہوں لیکن اس کا کیا علاج کہ شباب میرا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہیں — اگر حسن کی پیدا وار جاری ہے تو سمجھ لیجئے کہ میری بہت سالگی بھی ایک مستقل بالذات جوہر غیر فانی ہو کر رہ گئی ہے۔ آپ کو یقین نہ آئے گا، لیکن میرا تجربہ ہے کہ جس چیز کی زکوٰۃ ادا کرتے رہئے اس میں ترقی ہوتی رہے گی۔ زکوٰۃ حسن سے افزونی جمال کا حال تو مجھے معلوم نہیں لیکن شباب کے باب میں اس مسئلہ کی صداقت پر مجھے کامل اعتقاد ہے۔ آپ کہیں گے کہ ایک جگ کے بعد میں نے آپ پر اثباتِ وجود بھی کیا تو اس انداز سے۔ لیکن کیا کروں۔ آپ کو یاد کرنے کی فرصت مل گئی ہے تو جی نہیں چاہتا ہے کہ آپ کو اس نشہ سے بیگانہ رکھوں جو مجھ پر ایک مرض کی طرح طاری ہے۔ غالب کی اس حسرت کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہوگا :-

"کجا زہرہ صبح و جام بلور"

اور یقیناً یہ اجتماع بڑی "خدا ساز" بات سمجھی جاتی ہے، یعنی مذہب اس زندگی میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا اور پھر لطف یہ ہے کہ اس کی شکایت بھی کی جاتی ہے، حالانکہ جو چیز ترکِ اسلام کے بعد حاصل ہو سکتی ہے وہ ترکِ اسلام ہی کے بعد ملنے لگی۔ یہاں نہ کوئی دعا تھی نہ اس کے ردو قبول کا جھگڑا، فکر فضول تھی اور جرأت رندانہ! پھر "کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا" کہ "زہرہ صبح بھی ہے اور جام بلور بھی" "ماہ چہاردہم بھی ہے اور بادۂ انگور بھی" آپ کو یاد ہوگا جب اس ساری دنیا کا غم دل میں لئے ہوئے تڑپتا تھا، اب کائنات کو فراموش کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ دنیا نام ہے صرف اپنا اور "آن" کا ——— ہمیں جائے من دجائے تو باشد! کیا آپ کبھی میرا یہ احسان فراموش کر سکتے ہیں کہ میں نے اس عالم میں بھی آپ کو یاد کیا!

اس دس سال کے زمانہ میں مجھ پر کیا گزر گئی، آسمان کا ایک ایک ستارہ اس سے واقف ہے، فضا و بسیط اس داستان درد سے شاید اب بھی لبریز ہوگی، اگر آپ اس نوائے راز کے محرم ہوں تو سن لیجئے، سمجھ لیجئے مجھے اس کے اعادہ و تکرار پر مجبور نہ کیجئے، مجھ سے تو اب صرف یہ پوچھئے کہ "جب ساری دنیا سوتی ہے تو تم کیا کرتے ہو؟" میری طرح میں آہیں نہیں کرتا، کروٹیں نہیں بدلتا، آنسو نہیں بہاتا — میں جاگتا رہتا ہوں، میرا طالع جاگتا رہتا ہے، سوتا ہوں، نہ سونے دیتا ہوں، ہنستا ہوں، ہنساتا ہوں، مجروح ہوتا ہوں، مجروح کرتا ہوں، یہاں تک کہ جب میری دنیا میں صبح کا آفتاب دن کو بارہ بجے طلوع ہوتا ہے تو اس وقت بھی کوئی یہ کہکر ایک ریشمی معطر چادر میرے سر پر کھینچ کر ہٹا دیتا ہے کہ "ہوگا بھی" اور میں پھر غافل ہو جاتا ہوں ——— "دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم"

ذرا صبر کیجئے، میں آپ کو ابھی اور جلانا چاہتا ہوں ——— آپ کو یاد ہوگا جب ہم آپ کسی وقت ایک رند شاہد باز کی فرضی تصویر کھینچ کر گھنٹوں خیالی لطف حاصل کیا کرتے تھے ——— مجھے خبر نہیں کہ آپ کس عالم میں ہیں، لیکن باور کیجئے کہ عملی دنیا میں آنے کے بعد ہی یہ حقیقت روشن ہو سکتی ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کا خیال بھی اس ایک ادا کی حقیقت تک نہیں پہونچ سکتا جو بے اختیارانہ طور پر بیک وقت تمام وہ قیامتیں جو ابھی تک ابد میں پوشیدہ ہیں کسی کے لب یا جنبش چشم و ابرو سے نکل کر دل کو مسحور کر لیتی ہیں خدا کی قسم رند ہونا بھی کتنی بڑی نعمت ہے ——— لوگ اپنی تباہیوں پر مذہبی تسکین کی جستجو کرتے ہیں جہاں سے دے کے بڑی کائنات "دعا ہے" یا "تقدیر" ——— ذرا ان دونوں کی

بے نمکی ملاحظہ کیجئے معاذاللہ ـــــ اور پھر اس کے بعد بھی سکون معلوم ـــــ برخلاف اس کے، میری دنیا کے مراتب و مدارج کو ملاحظہ کیجئے کہ یہاں ہر بربادی ایک ایثار ہے اور ہر ناکامی اعترافِ لطف ـــــ آپ ہی انصاف کیجئے کہ شکایت و شکر میں کتنا تفاوت ہے ـــــ ایک وہ ہیں جو ظلم سے ڈرتے ہیں اور ایک وہ جو ستم کو دعوت دیتے ہیں، اور تم بھی شدید ترین ـــ آپ جانتے ہیں وہ شدید ترین ظلم کیا ہے؟ التفات فراواں ـــــ لطف بسیار ـــــ اچھا اندازہ کیجئے ـــــ "وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے" اگر صرف اپنی آغوش کے لئے وقف ہو، تو کیا ہو؟ ـــــ غالب کے فلسفہ کے لحاظ سے یہ ہو کہ خدا بھی رشک کرے دنیا کا کیا ذکر ہے، اور میں ـــــ اب یہ نہ پوچھئے کیونکہ اس بربادی کا افسانہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، سننے کی چیز نہیں۔

اب میں ختم کرتا ہوں یہ داستان لیکن ایک بات اور سن لیجئے ـــــ نگاہ اولین کا افسانہ ہے اس کی لذت کو میں اب تک چھپائے ہوئے تھا ـــ خیر تفصیل کا موقع نہیں اور نہ جرأت، مختصر کہنے میں خدا جانے آپ سمجھ سکیں یا نہیں ـ خیر یوں سمجھئے کہ ایک پیام روح تھا، نوید فردوس تھا، اور زیادہ غیر دلچسپ مذہبی زبان میں اشارۂ غیبی تھا، الہام فطرت تھا۔ ہاں لبوں سے زیادہ پرلطف وہ بوسہ ہے جو ایک نگاہ جھک کر دوسری نگاہ تک پہونچاتی ہے اسی کے یہ مختلف نام ہیں ـــ آپ کو جو پسند ہو انتخاب کر لیجئے۔ میں اسے صرف "خدا کو بھلا دینا" کہتا ہوں ـ کیونکہ انتہائی لذت وہی ہے جس کی ابتدا اس کیفیت سے ہو۔ شام کا وقت تھا لیکن شفق سے شرابور، اُدھر سورج ڈوب رہا تھا اور اِدھر ایک بدر کامل طلوع کر رہا تھا اُس کی چاندنی سمٹ کر ایک نقطہ میں تبدیل ہوئی اور پھر بڑھ کر تار نظر میں آپ کو شاید نہ معلوم ہوگا کہ اس ترکیب سے جو پیکاں طیار ہوتا ہے وہ اُلٹ کر صاحب ترکش کو بھی مجروح کر دیتا ہے یہ جراحت نام ہے اس تبسم کا جو ہونٹوں پر نہیں بلکہ چتونوں پر نمایاں ہوتا ہے ـــــ مجھے اس کا ہوش اس وقت ہوا جب ساحل قلابہ کی تاریکی میں صرف ایک ہی روشنی جگمگا رہی تھی ـــ کہاں؟ میرے پہلو میں، میری آغوش میں، میری نگاہ کے سامنے، میرے لبوں سے متصل اور میری روح کے اندر ـــــ طلوع و غروب کا مفہوم بدلکر اب صرف یہ رہگیا ہے کہ وہ "ہیں" اور "نہیں" ہیں، لذت و الم کے حقیقی فلسفہ کا راز منکشف ہوگیا اور اس طرح کہ میں اُن سے دور ہوں، یا نزدیک ـــــ ہائے وہ رات جس کی صبح کا مفہوم میرے لئے سوا اس کے کچھ نہ تھا کہ "بوئے یاسمن باقی ست" ـــــ میرے لئے قایم ہوکر رہ گئی ہے، میں نے یا کسی اور نے زمین سے اس کی گردش سلب کر لی ہے، ہیئت کے نظام کو بدلدیا ہے اور گرمی کی دوپہر کا آفتاب مجھ پر چاند کی خنک شعاعیں ڈالتا ہوا نظر آتا ہے ـــــ "حکم بر ستارہ کنم" تو نہایت ضعیف سی بات ہے، یہاں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میری محکوم ہے اور اگر میں برہم ہو جاؤں تو شاید خدا ساری دنیا سے بیزار ہوکر منہ موڑ لے ـــــ فرصت ہو تو آیئے اور دیکھ لیجئے کہ خلیفۃ اللہ فی الارض، زمین پر کیا آفتیں ڈھا رہا ہے ـــ یہ واقعہ آپ سمجھے کیا تھا ـــ میں وہاں تک لکھ چکا تھا کہ پیچھے پشت کی طرف سے ایک ہاتھ سے آنکھیں بند کر لی گئیں اور دوسرے ہاتھ سے خط چھین لیا گیا ـــــ میری آنکھیں نازک حنائی انگلیوں کو چوم رہی تھیں اور ان کی نگاہیں تحریر کے ایک ایک حرف کو ـــــ آنکھ سے ہاتھ ہٹا مگر ہونٹوں کو مسلتا ہوا، خط ہاتھ سے پھینکدیا گیا لیکن مجھے "شریر کہتا ہوا ـــــ اب آپ سے بھی باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا، اجازت دیجئے تاکہ اس فضاء معطر میں آنکھیں بند کرکے بیہوش ہو جاؤں ـــــ

آپ کا

آپ سے باہر

پورے دس سال کے بعد..... کی یہ تحریر مجھے ملی۔ اس زمانہ میں مجھے اور اس کے تمام احباب کو یقین ہوگیا تھا کہ یا تو وہ مرگیا ہے یا۔ ہندوستان سے باہر کسی دور دراز مقام کو چلا گیا ہے۔ اس لئے مجھے اس کا خط دیکھ کر بہت مسرت ہوئی اور تھوڑی دیر کے لئے میرا حزن و ملال دور ہوگیا اس وقت اُس کی تمام باتیں ایک ایک کرکے مجھے یاد آرہی تھیں اور اس کی تمام وہ رعنائیاں اور خوش ادائیاں جن کو دیکھ کر میں "جوانمرگی" کی پیشین گوئی عرصہ ہوا کر چکا تھا۔ نگاہوں کے سامنے تھیں ـــ آخرکار وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا ـــ اس سے زیادہ "جوانمرگی" اور کیا ہوسکتی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کے لئے صرف ایک نگاہ اداشناس کی ضرورت ہے اور اگر کبھی مل گئی تو پھر نہ اسے زندہ چھوڑ سکتی ہے نہ خود عرصہ تک زندہ رہ سکتی ہے۔

اس وقت میں بیقرار تھا کہ کسی طرح اُس کی گزشتہ زندگی کی ساری داستان سُن سکتا۔ گھڑی کو دیکھا تو معلوم کہ ابھی ایکسپریس کے روانہ ہونے میں ایک گھنٹہ کی دیر ہے ـــ فوراً ایک ضروری تار لکھا کہ ـــ "صبح کو پہونچوں گا" اور سامان سفر کی طیاری میں مصروف ہوگیا۔

میں پھر اسی بلدۂ موسیقی کی طرف جا رہا ہوں، جہاں اب سے پانچ سال قبل، صحیح معنی میں اُس ایک نگاہ کو دیکھا تھا جو "بظاہر نگاہ سے کم تھی" ـــ طبیعیات میں نگاہ، ایتھر کا اہتزاز و تموج ہو یا اس کا انعکاس ہو لیکن مجھ سے پوچھئے تو میں کہوں گا کہ وہ صرف کیفیت ہے روح کی، پیام ہے قلب کا کبھی فرمان کی صورت میں اور کبھی التجا کی رنگ میں ـــ غالب نے انتہائی نزاکت خیال سے کام لیا کہ ریاضی کے تحت اس کو "نیم" یا "ربع" میں تقسیم نہیں کیا، بلکہ "بظاہر" کہکر گویا یہ بھی بتا دیا کہ ممکن ہے وہ بلحاظ ادائے حُسن و لطفِ کیف پوری "نگاہ" ہو اور ہم "باندازۂ شوق" سے "کم" سمجھتے ہوں ـــ بہرحال سوادِ بمبئی شروع ہوتے ہی ایک ایک کرکے تمام اُن کیفیاتِ کی یاد ستانے لگی، جن کو ہر چند میں بھلا تو چکا ہوں، لیکن اس بھلانے کی ایذا کبھی نہیں بھول سکتی :-

جاتی ہے کشمکش کوئی اندوہ عشق کی ۔۔۔ گر دل نہیں رہا تو وہی دل کا درد تھا

ایک شام کا واقعہ ہے :-

ساحل آب پر خاموش تنہا بیٹھا ہوا قدرت کی اُس عظمت و جبروت کا مطالعہ کر رہا ہوں جس کا نام سمندر ہے ـــ حد نظر تک سوا ایک ہیجان سیال کے اور کچھ نظر نہ آتا، شب و روز لاکھوں کروروں سال سے اسی طرح اس کا متلاطم رہنا ـــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت اپنے آپ کو زمان و مکان سے آزاد کرنے کے لئے بیتاب ہے ـــ میں دیر تک اس تشکل "لانہایت" اس مرئی "ابدیت" پر غور کرتا رہا اور پھر کائنات کی اس بسیط فضا کا خیال کرکے جس میں ہمارا سارا نظام شمسی ایک جگنو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا حقیر ترین کرۂ زمین کی طرف ذہن منتقل ہوا اور پھر اس کی ارب در ارب آبادی میں اپنی ہستی پر غور کیا تو بے اختیار ہنسی آگئی۔

جس طرح خرد بینی جراثیم ہمارے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے، اس سے زیادہ بے حقیقت ہستی نوع انسان کی فطرت کی نگاہ میں ہے، پھر اس کے لئے حشر و نشر کا اہتمام، عذاب و ثواب کا طومار، بہشت و دوزخ کا قصہ، آخر کیوں؟ ـ یہ سب مفروضات ہیں جن کے ذریعہ سے انسان اپنی ہستی کی اہمیت متعین کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ عمان بسیط کو یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس کی رو میں کتنے خس و خاشاک بہکر کہاں سے کہاں چلے جاتے ہیں ـــ امیدل اپنے مخصوص انداز بیان میں اس خیال کو اس طرح ظاہر کرتا ہے :-

چو حباب بہت لباس توچہ توقع و چہ ہراس تو ۔۔۔ نہ تو مانی و نہ قیاس توچو کشند جامہ نہ پیکرت

حباب جو اپنی ہستی کے لحاظ سے صرف ایک لباس ہے، اس کو توقع یا ہراس سے کیا واسطہ جس وقت لباس اُتر گیا قصہ ختم ہوگیا: جامہ رہا یا کوئی پیکر۔

چاند افق سے بلند ہو چکا تھا اور اس کی زرد شعاعوں کا حزن و ملال فضا میں ایک سوگوارانہ کیفیت پیدا کرتا جا رہا تھا ـــ آج اُس کا چہرہ مجھے بہت غم آلود نظر آتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سامنے رو تو رہا ہو اور سر نہ اُٹھائے ـــ سمندر میں اُس کا انعکاس ڈبڈبائی ہوئی آنکھ کی کیفیت پیدا کر رہا تھا ـــ آنکھ بھیگی ہوئی تھی، لیکن اس کا نم ایسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی تنہا کمرہ بال خشک

کرنے کے بعد بازو پر سر رکھ کر لیٹ جائے۔ دور چوپاٹی کے ساحل پر برقی فانوسوں کی پُرخم قطار ایسی نظر آرہی تھی جیسے کسی گلے کا ہار اور چونکہ وہاں کا ہنگامہ میری نگاہ و سماعت سے بہت دور تھا اس لئے یہ سارا منظر ایک اثیری (Ethereal) کیفیت رکھتا تھا۔ —— میں ساحل پر لیٹ گیا اور دیر تک غور کرتا رہا کہ اس وسیع کائنات میں میرا وجود بھی وہی حکم رکھتا ہے جیسے ریگستان میں کسی کا نقش قدم کہ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اس کے لئے پیام فنا ہے۔

ستارے جھلملا رہے تھے اور ان کی روشنی کا قبض و بسط گویا غالب کے اس مصرع کی تکرار کر رہا تھا۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق

اور میں بھی اسکی ہاں میں ہاں ملا کر یہی کہہ رہا تھا کہ "ہاں، کون ہوتا ہے؟" —— "کس میں اتنی تاب ہے" —— کہ دفعتاً قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی اور اسی کے ساتھ ایک ایسی کراہ کے ساتھ جس میں روح کا انتہائی حزن و ملال پنہاں تھا گویا کسی نے یہ کہا:۔

"کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد"

میں اُٹھ کر اُس طرف متوجہ ہونا ہی چاہتا تھا کہ کوئی ساحل سے پانی میں تھا اور تھوڑی دیر کے بعد موج کی اس آغوش میں جس کا ہلکا سا فشار بھی ہمیشہ کے لئے بے خبری کی نیند سلا دیتا ہے۔ صبح کو سمندر کی دیوی نے اس نازنیں کی روح کی قربانی قبول کر کے اسکے جسم کو پھر ساحل پر لا کر ڈال دیا جستجو سے سوائے اُس ایک کاغذ کے بنڈل کے جس میں ایک ہار و ایک رومال اور ایک خط تھا اور جس کو وہ ساحل ہی پر چھوڑ گئی تھی نہ کوئی اور چیز ملی نہ یہ پتہ چلا کہ وہ کون تھی اور کس کی داغدار —— خط کا مضمون یہ تھا:۔

"اب تو خوش ہو بیوفا تیرا ہی لے کہنا کیا"

"تمہاری محبت طوفان کی طرح آئی اور میرا سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی، ہائے وہ بھی کیا عالم نامرادی تھا۔ کہ تمہاری محبت کی تمام لذتیں میرے لئے مخصوص تھیں اور میں ان کے اعتراف سے بھی عاجز تھی۔ ایک زمانہ گزر گیا۔ یہ میری زندگی کا وہ عہد تھا جسے میں نے ہمیشہ دور شراب سمجھا، یہاں تک کہ ہر نشہ کی طرح اس پر بھی زوال آیا، اس لئے نہیں کہ میں نے اُسے رد کیا بلکہ اس وجہ سے کہ تمہارے جرعہ ہائے اُلفت اب میرے لئے مخصوص نہ تھے۔ پھر جس طرح وہ شراب آہستہ آہستہ "رسا" ہوئی تھی، اسی طرح رفتہ رفتہ وہ ایک "آب ناصاف" کی صورت اختیار کرنے لگی یہاں تک کہ یہ "چشمۂ حیات" میرے لئے بالکل خشک ہو گیا اور تم باوجود میری انتہائی التجاؤں کے میری روح کی اس تشنگی کو بجھانے کے لئے آمادہ نہ ہوئے اور آخر کار نوبت یہاں تک پہونچی کہ تمہارے بت کے سامنے میری آنکھوں نے دل کا آخری قطرہ تک پیش کر دیا، لیکن تمہارا وہ قاتل و خونیں تبسم، جس کو میں نے پہلے صرف تبسم بہار سمجھا تھا، اب بھی بدستور قایم تھا۔ آخر آخر میری صرف یہی ایک التجا تم سے رہ گئی تھی کہ خدا کے لئے تم مسکرانا چھوڑ دو —— میں درد و غم سے بے تاب اور تم تبسم!، میں تمہاری بے وفائیوں اور بیدردیوں کی داستان سے لبریز، اور تم تبسم! میں تڑپ رہی ہوں، تم مسکرا رہے ہو، میں رو رہی ہوں تم مسکرا رہے ہو یا اللہ، یہ کیا قیامت ہے! —— میں نے بارہا کہا کہ تم کو پاسِ وفا نہیں نہ ہو، تم مجھ سے بیزار ہو گئے ہو، مجھے گوارا، تم میری محبت کو ٹھکرانا چاہتے ہو، مجھے منظور، لیکن میں یہ کیونکر برداشت کر سکتی تھی کہ تم اپنے تبسم سے مجھے جھٹلاؤ، اپنی بے پروائی سے مجھے جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرو۔

گزشتہ چھ ماہ کی زندگی میں تمہاری محبت کے عروج و انحطاط کے جو منازل مجھ پر گزر چکے ہیں وہ ایسے معمولی نہیں کہ مجھے زندگی و موت میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے پر مجبور نہ کرتے۔ پھر جب یہ دیکھا کہ ایک وقت انسان پر ایسا بھی آسکتا ہے جو زندگی کو موت سے بدتر سمجھنے لگے تو چارۂ کار سوا اس کے اور کیا تھا کہ موت کو ترجیح دیتی کیونکہ کم از کم یہاں

پہونچ کر مجھے تمہاری مسکراہٹ کے دیکھنے کا تو اندیشہ نہ تھا جس کی بوئے خون مجھے ہمیشہ لرزہ براندام کر دیتی تھی تمہاری محبت کے اولین ہدایا جنھیں عزیز رکھنے کی کوشش میں آخر کار مجھے جان دینا بھی گوارا کرنا پڑا اسی دنیا میں چھوڑے جاتی ہوں جہاں ایک زمانہ تک انھوں نے مجھے تڑپائے رکھا ـــــ یہ ہار جسے میرے دل کی دھڑکن نے خدا معلوم کس کس طرح بیقرار رکھا اور یہ رومال جس میں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کہ میرے کتنے آنسو جذب ہو چکے ہیں، چھوڑے جاتی ہوں اس لئے نہیں کہ آپ انھیں میری یادگار سمجھ کر محفوظ رکھ لیں، بلکہ صرف اس غرض سے کہ جب آپ انھیں دیکھیں تو ایک مرتبہ پھر مسکرا دیں ـــــ خدا کرے میری موت کی پہلی رات آپ کی حیات نشاط کا اولین نوروز ہو۔

بدنصیب

ز۔ رخ

یہ واقعہ بھی منجملہ اور بہت سے واقعات کے ہے جو میری سابق سیاحت بمبئی کو ہمیشہ تازہ رکھیں گے۔

گاڑی جس وقت اسٹیشن پر پہونچی تو افضال پلیٹ فارم پر موجود تھا، میں اُترا اور دیر تک اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ میرے تصور نے جو خیالی تصویر اس کی قایم کی تھی وہ یقیناً بہت مختلف تھی، میں سمجھتا تھا کہ وہ بھی میری ہی طرح ایک افسردہ چہرہ، ایک مضمحل صورت رکھتا ہوگا اور زمانہ کے تلخ تجربات نے اس کے خدوخال پر بھی کافی نقوش چھوڑے ہوں گے لیکن وہ ہنوز نوجوان شباب کی تصویر تھا، جوانی کی شگفتگی اس کے خدوخال سے ظاہر ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میری ناکام زندگی کا انتقام دنیا کے ذرہ ذرہ سے لے رہا ہے میں اس وقت سراپا استفہام تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی کا افسانہ بیک وقت مجھے سنا دے، لیکن میں حیران تھا کہ کہاں سے سوال کی ابتدا کروں، وہ یہ سب کچھ سمجھ رہا تھا اور صرف مسکرا رہا تھا ـــــ آخر کار گھبرا کر ایک مرتبہ یہ سوال کر ہی دیا کہ:-

"افضال خدا کے لئے بتاؤ تم کیا ہو، کون ہو، کہاں ہو" وہ یہ سن کر ایک ایسے قہقہے کے ساتھ جس میں شراب کا نشہ ملا ہوتا ہے ہنسا اور بولا "آزاد ہوں، انسان ہوں، اور وہاں ہوں جہاں ہر شخص کی رسائی ناممکن ہے۔

"خدا کے لئے عملی دنیا اور مادی عالم کی باتیں کرو۔ تمہارے معمے کسی وقت فرصت سے بیٹھ کر حل کروں گا، اس وقت میری بیتابیاں اس کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں دنیا کو ہمیشہ قمارخانہ کہا کرتا تھا! لیکن یہ نہ سمجھ میں آتا تھا کہ اس میں بازی کس طرح لگانا چاہئے کہ جیت اپنی رہے میں اس دس سال کے عرصہ میں کامل ۷ سال تک یورپ میں رہا اور وہاں جا کر معلوم ہوا کہ یہ کھیل کس طرح کھیلا جاتا ہے، میں نے اس فن کو وہاں سیکھا اور پھر اس کا علم صرف مجھی کو ہے کہ کس بے دردی کے ساتھ اپنے دین و ایمان، اپنے اخلاق و انسانیت یہاں تک کہ اپنی روح کی قربانی اس پر چڑھانے کے بعد میں نے اس فن کو حاصل کیا اور پھر چونکہ میں نے اس کو نہایت گراں قیمت دے کر حاصل کیا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کو عزیز نہ سمجھوں اور اب اس کے نتائج سے متمتع نہ ہوں۔ یاد رکھئے کہ اگر ضرورت ہوئی تو میں آپ کو بھی اپنے اس کھیل سے دھوکا دینے میں دریغ نہ کروں گا اور میں ایک لمحہ کے لئے بھی تاسف نہ کروں گا، اگر اپنے ذرا سے نفع کے لئے آپ کو بڑے سے بڑا نقصان کسی وقت پہونچا دوں"

میں نہایت حیرت سے اس کی گفتگو سن رہا تھا اور اس کا ہر فقرہ میری نگاہ سے ایک حجاب اٹھاتا جاتا تھا۔ موٹر آہستہ ہو کر ساحل قلابہ کی ایک شاندار کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہوا اور رواق (portico) میں پہونچ کر ٹھہر گیا۔ تمام احاطہ، کوٹھی کے در و دیوار، رواق کی محراب، زینہ، چھت، ستون، غرض اس عمارت کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں پھول ہی پھول نہ نظر آتے ہوں سامنے نہایت ہی شگفتہ اور پاکیزہ خانہ باغ محرابوں اور دیواروں پر خوشنما بیلیں، چھت میں معلق گملے اور جا بجا خوبصورت چڑیوں کے پنجرے، یہ تھا وہ

سب سے پہلا منظر جو میرے سامنے آیا۔ خادم نے دروازہ کھولا اور افضال ایک ایسی شان کے ساتھ جس میں سرمایہ دارانہ تمکنت سے زیادہ ایک شاہانہ تسلط کا غرور پایا جاتا تھا، نیچے اترا اور نرم ایرانی قالینوں کے فرش سے گزرتا ہوا مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا جس کی پرتکلف آرائش یقیناً جنت طلب و روح تھی۔ میں اپنے معمولی ملبوس اور دہقانی وضع میں یہاں بیٹھا ہوا خود اپنے کو برا معلوم ہو رہا تھا اور بعض مرتبہ یہ بھی خیال پیدا ہوتا تھا کہ کہیں افضال کو بھی میرا آنا ناگوار نہ ہوا ہو ــــ افضال بھی اسی کوچ پر بیٹھ گیا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا اور بولا کہ "فرمایئے آپ میری داستان سننے نہیں بلکہ دیکھنے کے لئے کب تک طیار ہو سکیں گے"۔ اس کے چہرے کے نشاط اور بے اختیارانہ تبسم کو دیکھ کر اس کی وہ تحریر میری نگاہوں کے سامنے آگئی۔ جس کو پڑھ کر میں یہاں آیا تھا، اور ان سب باتوں کو مربوط کرنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ اس کا مقصود کیا تھا۔ میں نے نہایت ہی غیر محسوس طور پر اپنی حالت کا مطالعہ کیا، اور بولا :۔ "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہاری داستان صرف سن لیجائے"، وہ شروع ہی سے بے انتہا حساس تھا اور معمولی سی بات میں اس کی باریک جلد کے نیچے خون دوڑ جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر رنگین ہو گیا اور نہایت ہی ہلکی سی خشونت کے ساتھ بولا :۔ "ممکن تو ہے مگر آپ کو یقین نہ آئے گا"۔ میں نے پھر اسے مستفسرانہ انداز سے دیکھا۔ اب اس پر ایک خاص کیفیت طاری تھی، نہایت بے خودانہ انداز سے بولا :۔ "اگر میں آپ سے کہوں کہ میں نے چاند کو طلوع ہوتے دیکھا تو آپ یقین کر لیں گے لیکن اگر میں یہ کہوں کہ چاند میری آغوش میں آگیا تو آپ کبھی باور نہ کریں گے، اسی طرح اگر میں یہ بیان کروں کہ شفق کی رنگینیاں، بہار کی عطر بیزیاں مجسم ہو کر میری آغوش میں آگئیں تو بھی آپ کو یقین نہ آئے گا ــــ یونان کی دیوی، زہرہ کا مجسمہ ایک مادی حقیقت ہے جس کا مشاہدہ ہر وقت ہو سکتا ہے، لیکن اگر کوئی یہ دعوے کرے کہ اس پیکرِ سنگین میں کسی کے لئے کبھی جان بھی آجاتی ہے تو آپ کا گیا کوئی بھی اسکی تصدیق نہ کرے گا۔ پھر آپ ہی بتایئے کہ میرا افسانہ سننے کی چیز ہے یا دیکھنے کی؟" افضال یوں تو ہمیشہ سے حسّاس و فکر آشنا عر تھا، لیکن اب میں اسے مقال کے لحاظ سے بھی شاعر دیکھ رہا تھا۔ وہ گفتگو کر رہا تھا اور اس کا تنفس تیز ہوتا جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جذبات کے لحاظ سے وہ اپنے سینہ کو بہت تنگ پاتا ہے ــــ اس نے قریب کی میز سے شیشہ اٹھا کر گلاس میں شراب انڈیلی اور میرے سامنے بڑھایا ــــ میرے ہلکے سے تبسم سے وہ میرے انکار کو سمجھ کر بغیر کسی مزید اصرار کے خود پی گیا اور میز پر گلاس کو رکھتے ہوئے یہ نرم سر میں گنگنانے لگا :۔

نخستین بادہ کاندر جام کردند
ز چشم مست ساقی وام کردند

(باقی)

چند نایاب کتابیں

دیوان اصغر گونڈوی = (للعہ ر) ــــ دیوان جان صاحب = (۳۷ ر) ــــ کلیات میر تقی میر = (عنہ ر) کلیات اکبر الہ آبادی ۳ حصے = (عنہ ر) ــــ آفتاب داغ = (۵ ر) ــــ انتخاب داغ = (للعہ ر) ــــ ماہتاب داغ = (عنہ ر) ــــ یادگار داغ = (۳۷ ر) ــــ بہار داغ = (للعہ ر) ــــ گلزار داغ = (عنہ ر) ــــ دیوان مجروح = (۵ ر) دیوان امیر اللہ تسلیم = (۲۷ ر) ــــ دیوان قلق = (۵ ر) ــــ صنمخانۂ عشق = (۳۷ ر) ــــ کلیات نظیر اکبر آبادی = (۳۷ ر) ــــ دیوان آتش (عنہ ر) کلیات آتش = (عنہ ر) ــــ نگارستان فارس = (عنہ ر) ــــ شمیم سخن تذکرۂ شاعرات = (للعہ ر) ــــ ہندو شعراء = (۳۷ ر) ــــ آب بقا (۵ ر) کلیات طیبات۔ مکتوبات = (عنہ ر) ــــ فتوح الغیب = (عنہ ر) ــــ فرہنگ جہانگیری ۲ جلدیں = (للعہ ر) ــــ کشف اللغات اولمی (۵ ر) غیاث اللغات مع چراغ ہدایت = (۵ ر) ــــ کلیات عراقی = (۵ ر) ــــ کلیات جامی = (۵ ر) ــــ کلیات مرزا جلال اسیر (عنہ ر) کلیات قاآنی = (۵ ر) ــــ تاریخ کشمیر اعظمی = (عنہ ر) ــــ گلستانِ مسرت = (۵ ر) ــــ کلیات سودا = (عنہ ر)

منیجر نگار لکھنؤ

جمال الدین افغانی کا ایک خطبہ

(مظفر حسین شمیم۔ کلکتہ)

میں نہایت خوش ہوں کہ اس موقع پر اس قدر ہندی نژاد جمع ہیں جو فضل و کمال سے آراستہ اور تحصیل علم کے لئے کوشاں ہیں! مجھے اس امر پر بھی خوش ہونا چاہیئے کہ یہ نونہال اس ہندوستان کے فرزند ہیں جو مہد انسانیت اور گہوارۂ آدمیت ہے یہ وہی ہندوستان ہے جہاں سے انسانیت نکل کر سارے عالم میں منتشر ہوئی!

یہ نونہال اسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں جہاں پہلی مرتبہ دائرۂ معدل النہار معین ہوا، اور پہلی مرتبہ معدل النہار سے منطق البروج بنایا گیا، یہ دو دائرے اُس وقت تک نہیں بن سکتے جب تک ہندسہ میں کمال نہ ہو! پس ظاہر ہوا کہ علم حساب اور ہندسہ ہندیوں کی ایجاد ہے یہ نوجوان اسی سرزمین کی اولاد ہیں جس نے تمام عالم کو قوانین اور ادب کو سبق پڑھایا اگر کوئی شخص غور سے رومن کوڈ (قوانین ملت روما) کا مطالعہ کرے جو تمام فرنگی قوانین کا سرچشمہ ہے تو اسے صاف معلوم ہوگا کہ وہ چاروں ویدشاستروں سے ماخوذ ہیں! ادب و شعر میں یونانی ہنریوں کے خوشہ چین ہیں، چنانچہ فیثاغورث جس نے یونان میں علوم و معارف کی نشر و اشاعت کی وہ اہل ہند کا ادنیٰ شاگرد تھا یہ خاک ہند وہی خاک ہے یہ ہوا وہی ہوا ہے اور یہ نوجوان اسی خاک آب اور ہوا کا نتیجہ ہیں، اس لئے میں بہت خوش ہوں کہ یہ لوگ خواب دراز کے بعد جو نکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنی میراث پر قبضہ کرلیں اور اپنے لگائے ہوئے درخت کے میووں سے اپنا دامن بھرلیں۔

اب میں چاہتا ہوں کہ علم و تعلیم کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن مشکل یہ ہے کہ علم کی کوئی حد معین نہیں ہے، علم و حکمت کا سمندر بے پایاں ہے اور ہمارے افکار متناہی ہیں لہذا یہ غیر ممکن ہے کہ ایک متناہی شے غیر متناہی کا احاطہ کرے، دوسرے یہ کہ علم کے بیان میں ہزاروں فصحا بلغاء اور حکماء اپنی فصاحت، بلاغت اور حکمت کے جوہر دکھا چکے ہیں پھر مجھ ایسے تہی مایہ کے لئے اس موضوع پر لب کشائی کرنا دشوار ہے، باوجود اس کے طبیعت قبول نہیں کرتی کہ اس کی فضیلت کو بیان نہ کروں اگر کوئی غور کرے، تو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا کا بادشاہ علم ہے، بغیر علم کے نہ بادشاہی پہلے تھی نہ اب ہے اور نہ کبھی رہے گی، کلدانی فاتح خصوصاً سیمراس جس کا حدود تاتار سے ہند تک پھریرا اڑتا تھا وہ کلدانی فاتح نہ تھا بلکہ دانش و علم تھے، وہ مصری جنھوں نے اپنے ملک کو بہت بڑی وسعت دی انھیں میں سے ایک بادشاہ رامسیس ثانی مسوپوٹمیا (بین النہرین) تک پہونچ گیا اور دوسری روایت کے بموجب ہندوستان تک اپنا پھریرا ذرا اڑا دیا، سچ تو یہ ہے کہ یہ مصری نہ تھے بلکہ علم تھا، فنیقی باشندے جنھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے جزائر برطانیہ، بلاد ہسپانیہ نگاہیں اور یونان کو اپنے مستعمرات میں داخل کرلیا حقیقتاً وہ فنیقی نہ تھے بلکہ علم تھا جس نے اپنے یہ قدرت کو اس قدر قوت بخش دی تھی، سکندر یونان سے ہندوستان میں نہیں آیا اور نہ ہندوستانیوں پر غلبہ کیا بلکہ وہ علم تھا جس نے یونان سے آکر ہندوستان پر قبضہ کرلیا، یہ فرنگی جنھوں نے اس زمانہ میں چاروں طرف دست درازی شروع کر دی ہے، انگریز جو افغانستان تک پہونچے ہوئے ہیں، فرنگ (فرانس) ٹیونس پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ یہ تطاول یہ دست درازی اور ملک گیری نہ انگریز کر رہے ہیں، نہ فرانسیسی بلکہ ہر طرف علم و شوکت و عظمت ظاہر ہے اور جہل ہے کہ علم کے سامنے اظہار عجز اور اعتراف عبودیت کرتے ہوئے سرنگوں خاک مذلت پر پڑا ہوا ہے، پس حقیقتاً بادشاہی خانۂ علم سے کبھی باہر نہیں گئی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ بادشاہ ہمیشہ اپنا پایۂ تخت بدلتا رہا ہے، کبھی یہ مشرق سے مغرب گیا اور

کبھی مغرب سے مشرق آیا، اگر اس سے گزر کر ہم دنیا کے غنا و ثروت پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ غنا و ثروت، تجارت، صناعت و زراعت کے نتائج ہیں اور زراعت، علم و فلاحت و نباتات، ہندسہ کے بغیر ناممکن ہے، صناعت کیمسٹری اور فرنگ، جر اثقال، ہندسہ و حساب کے بغیر کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور تجارت کا دارومدار صناعت و زراعت پر ہے، پس معلوم ہوا کہ تمام ثروت و غنا علم کا نتیجہ ہے!! اور علم کے سوا کوئی غنا نہیں، بالجملہ تمام عالم انسانی عالم صناعی ہے یعنی دُنیا، دُنیائے علم ہے اگر عالم انسانی سے علم نکال لیا جائے تو کوئی انسان باقی نہیں رہے گا، علم انسان کو ہزار دس ہزار انسانوں کی قوت بخشتا ہے، جتنا زیادہ علم ہوگا اتنا ہی زیادہ انسان اپنے آپ کو فایدہ پہونچا سکتا ہے، حکومتوں کو اپنی رعایا سے بقدر علم نفع پہونچ سکتا ہے۔

ہر حکومت کا فرض ہے کہ اپنے نفع کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے علوم و معارف کی تاسیس و نشر کی کوشش کرے، فرض کرو کسی شخص کا باغیچہ ہو تو وہ از روئے قانون فلاحت، زمین کو ٹھیک بنائے گا، درختوں اور نباتات کی اصلاح کی کوشش کرے گا؟۔ اسی طرح حکام کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی منفعت کی خاطر علوم کو پھیلانے کی سعی کریں جس طرح باغیچہ کا مالک اپنی ملک کی طرف توجہ نہیں کریگا تو اس کی ذات کو نقصان پہونچے گا، اسی طرح اگر بادشاہ اپنی رعایا کی تعلیم کی طرف سے غفلت کرے گا تو حکومت کو ضرور اس سے ضرر پہونچے گا، جو بادشاہ جاہلوں پر حکومت کرتا ہے اس بادشاہ سے کیا فایدہ ہے؟ اور ایسی حکومت کا نام حکومت کس طرح رکھا جا سکتا ہے؟

تعلیم، تعلم اور مراتب علوم

جب شرف علم تھوڑا سا معلوم ہو چکا تو اب میں چاہتا ہوں کہ تعلیم، تعلم اور مراتب علوم کے متعلق چند کلمے عرض کروں، یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہر علم کے لئے خاص موضوع اور اس موضوع کے مطابق عوارض و لوازم کے سوا اس علم میں کسی غیر متعلقہ چیز سے بحث نہیں کی جا سکتی مثلاً علم فزیک عالم خارجی کے خواص اجسام سے بحث کرتا ہے اور ان دوسرے امور سے جو عالم انسانی میں لازم ہیں معترض نہیں ہوتا، علم کیمیا یعنی کیمسٹری میں خواص اجسام کی تحلیل و ترکیب کی حیثیت و نوعیت پر بحث ہوتی ہے، علم نباتات "بوٹانی" صرف نباتات کو اپنا موضوع بحث قرار دیتا ہے، بعینہ دوسرے تمام علوم کی یہی کیفیت ہے، ان علوم میں سے کوئی کبھی اپنے موضوع سے خارج مباحث پر بحث کرتا۔ یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اگر علم کو ایک شخص تصور کر لیا جائے تو یہ جتنے علوم ہیں وہ سب اس کے اعضاء قرار پائے اور جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ایک عضو جسم کے دوسرے اعضاء سے الگ ہو کر اپنا وجود قایم رکھ سکے، بعینہ تمام علوم میں سے اگر کوئی علم بالکل الگ کر دیا جائے تو وہ باقی نہیں رہ سکتا، چونکہ ان میں سے ہر ایک حساب و ہندسہ کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہے، اس لئے ایک علم بغیر دوسرے علوم کی استمداد کے نہیں سمجھا جا سکتا ہے، یہی سبب ہے کہ اگر ایک علم کو دوسرے علوم سے بالکل علٰحدہ کر دیا جائے تو اس میں بالکل ترقی نہیں ہو سکتی اور نہ وہ پائیدار ہو سکتا ہے! پس ایک ایسا علم ہونا چاہئے جسے تمام علوم کی روح کہا جا سکے! وہ علم جسے تمام علوم کی جان کہا جا سکتا ہے۔ فلسفہ یعنی حکمت ہے کیونکہ اس کا موضوع عام ہے، فلسفہ انسانی لوازم سے انسان کو خبردار کرتا اور دوسرے علوم کی حاجتوں سے آگاہ کرتا ہے اگر کسی قوم میں فلسفہ نہ ہو اور اس قوم کا ہر فرد ان تمام علوم سے آگاہ نہ ہو جن کے موضوع خاص ہوں تو یہ ممکن نہیں کہ صرف ایک صدی ہی تک ان میں وہ علوم باقی رہ جائیں اور ناممکن ہے کہ وہ امت روح فلسفہ کے بغیر ان علوم سے نتائج نکال سکے! دولت عثمانی اور خدیو مصر کی حکومت نے ساٹھ برس سے علوم جدیدہ کی تعلیم کے لئے مدارس کھول رکھے ہیں، لیکن ابھی تک انھیں ان علوم سے کوئی فایدہ نہیں پہونچا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ان مدارس میں فلسفہ نہیں ہوتا ہے، دوسرے علوم جو اعضاء کی مانند ہیں بغیر روح فلسفہ کے وہ کسی قسم کا پھل دینے کی اہلیت نہیں رکھتے، اگر ان مدارس میں فلسفہ بھی ہوتا تو اس ساٹھ برس کے طویل زمانہ میں یہ لوگ بلاد فرنگ سے مستغنی ہو جاتے اور علم سے اپنے ممالک میں اصلاح کی کوشش کرتے، ہر سال اپنی اولاد کو ممالک فرنگ میں بھیجنے کی حاجت نہ رہتی اور اپنے مدرسوں کے لئے فرنگی استادوں کی ضرورت نہ پڑتی، میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر ایک امت میں روح فلسفہ موجود ہے اور ان میں وہ علوم جن کا موضوع خاص ہے

موجود نہیں ہیں تو صرف وہی روح فلسفی ان تمام علوم کو حاصل کرنے کے لئے آمادہ کرے گی۔

صدر اولیٰ کے مسلمان

صدر اولیٰ کے مسلمانوں میں کوئی علم نہ تھا لیکن ذہانت اسلامی کی وجہ سے ان میں ایک روح فلسفہ پیدا ہوگئی تھی، صرف اس روح فلسفہ کے واسطے سے انھوں نے تمام امور عالم اور لوازم انسانی سے بحث کرنی شروع کر دی یہی سبب تھا کہ انھوں نے منصور (عباسی خلیفہ) کے زمانہ میں ایسے تمام علوم کو جن کا موضوع بحث خاص تھا سریانی، یونانی اور پارسی سے عربی میں ترجمہ کر کے تھوڑے دنوں میں سیکھ لیا؟ فلسفہ ہی وہ علم ہے جو بتلاتا ہے کہ انسان کو انسان سے کیا سلوک کرنا چاہئے؟ شرفِ انسانیت کیا ہے؟ طریق ہائے لایقہ کون کون سے ہیں؟ ہر اُمت جو قعرِ پستی میں گر پڑی، اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ سب سے پہلے ان کی روح فلسفی میں نقص پیدا ہوا، اس کے بعد وہی نقص ان کی تمام معاشرت اور ادب و علوم میں سرایت کر گیا!۔ جب مراتبِ علوم اور شرف فلسفہ اس قدر معلوم ہو چکا تو اب میں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی تعلیم و تعلم کے بارے میں کچھ عرض کروں! اس عہد میں مسلمانوں کو اپنی تعلیم سے کوئی فایدہ نہیں ہوتا مثلاً وہ علم نحو کی تحصیل کرتے ہیں، علم نحو کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص لغتِ عربی پر حاوی ہو جائے اور اس سے اُسے لکھنا پڑھنا اور بولنا آجائے لیکن اس زمانہ میں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سارا سارا سی مقصد پر بے فایدہ صرف کر دیتے ہیں اور اتنی مدت ضایع کرنے کے بعد بھی وہ عربی لکھنے پڑھنے اور بولنے پر قادر نہیں ہوتے علم معانی و بیان جسے ادبیات کہتے ہیں وہ علم ہے کہ اس سے انسان منشی، خطیب اور شاعر بنتا ہے، لیکن اس عہد میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اسکے حاصل کرنے کے بعد لوگ معمولی صحیح گفتگو کرنے کے بھی لایق نہیں ہوتے، علم منطق وہ علم ہے جسے ہر شخص کو حاصل کرنا چاہئے اس سے حق باطل میں تمیز اور کھوٹے کھرے کا فرق معلوم ہوتا ہے لیکن افسوس کہ مسلمانوں کے منطقیوں کے دماغ خرافات و واہیات خیالات کا خزینہ بنے ہوئے ہیں اُن کے خیالات اور بازاریوں کے افکار میں کوئی فرق نہیں ہوتا، علم حکمت وہ علم ہے کہ موجودات خارجیہ کے احوال سے بحث کرتا اور اُن کے علل و اسباب، لوازم و ملزومات سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر مزہ یہ ہے کہ ہمارے علماء شمس البازغہ سے اس علم کی ابتدائی باتیں پڑھ کر اپنے آپ کو حکیم سمجھ لیتے ہیں اور باوجود حکیم ہونے کے خود اپنی شناخت بھی نہیں کر سکتے۔ اس پر کبھی غور نہیں کرتے کہ ہم کون ہیں کیا ہیں؟ ہمیں کیا کرنا چاہئے، ہمارا کیا فرض ہے، عجیب مزہ یہ ہے کہ اپنے سامنے لمپ رکھ کر رات بھر شمس البازعہ رٹتے رہتے ہیں، لیکن اس نکتہ پر غور نہیں کرتے کہ اگر لمپ کے شیشے کو نکال لیں تو اس سے دھواں کیوں نکلنے لگتا ہے اور اگر پھر لگا دیں تو دھواں کیوں نہیں نکلتا؟ ایسے حکیم پر تین حرف اور ایسی حکمت پر لعنت!!!

حکیم وہ ہے کہ تمام حوادث و اجزائے عالم اس کے ذہن کو حرکت دیں نہ کہ وہ جوا ندھوں کی طرح ایک ڈگر پکڑ لیتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ اس کی انتہا کہاں اور منزلِ مقصود کدھر ہے، مسلمانوں کا علم فقہ تمام حقوق منزلیہ مدنیہ اور دولیہ پر حاوی ہے پس ایسا شخص جو اس علم کا عالم ہو وہ اس لایق ہے کہ ملک کا صدر اعظم یا حکومت کا سفیر ہو، مگر جب مسلمانوں کے فقہا پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر کے انتظام ہی سے عاری ہیں مگر اپنی بیوقوفی کو سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں! علم اصول کے معنی فلسفۂ شریعت ہیں۔ جو شخص اس علم پر قادر ہو اُسے واضع قوانین اور مدنیت کا علمبردار ہونا چاہئے، مگر مسلمانوں میں اس علم کے جو پڑھنے والے ہیں وہ فوائد قوانین، قواعد مدنیت اور اصلاح عالم سے بے خبر ہیں، اس زمانہ میں ہمارے علماء کی یہ کیفیت ہے گویا وہ ایک بہت بھاری فتیلہ ہیں کہ سر پر شعلہ تو ہے، لیکن وہ اس قدر چھوٹا ہے کہ نہ اپنے اردگرد روشنی پہونچا سکتا ہے اور نہ دوسرے اس سے اُجالا پا سکتے ہیں۔

عالم، اگر حقیقی عالم ہے تو وہ ایک نور ہے۔ اگر عالم صحیح معنوں میں عالم ہے تو اُسے چاہئے کہ ایک عالم پر روشنی ڈالے اگر اتنا نہ ہو سکے تو کم از کم اپنے شہر، گاؤں، یا کچھ نہیں تو اپنے گھر ہی کو اس روشنی سے منور کر دے، مگر اس شخص پر عالم کا کیسے اطلاق ہو سکتا ہے جو اپنے گھر تک علم کی روشنی سے منور نہیں کر سکتا؟ اس پر طرہ یہ ہے کہ ہمارے علماء نے اس زمانہ میں علم کو دو اقسام پر منقسم کر دیا ہے، ایک کو مسلمانوں کا علم کہتے ہیں اور دوسرے کو علم فرنگ کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بعض نہایت کارآمد اور مفید علوم کی تحصیل سے منع کرتے ہیں اور نہیں

سمجھتے کہ علم کو کسی خاص طائفہ سے نسبت نہیں ہوسکتی جو چیز پہچانی جاتی ہے وہ علم ہی کے صدقے سے پہچانی جاتی ہے جو طائفہ ترقی کرتا ہے وہ علم ہی کی بدولت ترقی کرتا ہے، علم سے انسانوں کو نسبت ہونی چاہئے : یہ کہ علم سے انسان کو نسبت دیجائے ؟

کتنے تعجب کی بات ہے کہ وہ علوم جو ارسطو سے منسوب ہیں انھیں تو مسلمان نہایت رغبت سے پڑھتے ہیں گویا ارسطو بھی مسلمان تھا! لیکن اگر گلیلیو، نیوٹن اور کیپلر سے نسبت دیجائے تو کفر کے فتوے لگنے لگیں گے ؟ حقیقت یہ ہے کہ جس جگہ براہین اور دلایل موجود ہوں وہیں حق بھی موجود رہتا ہے، وہ لوگ جو ان علوم و معارف سے منع کرتے ہیں، جہالت کی وجہ سے بزعم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مذہب اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں، حالانکہ علوم و معارف اور مذہب اسلام کی بنیادوں میں کوئی بھی نہیں ہے، حجۃ الاسلام امام غزالی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف " منقذ من الضلال " میں کہتے ہیں کہ وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ اولہ ہندسیہ براہین فلسفیہ اور قواعد طبیعیہ اسلام کے خلاف ہیں، وہ شخص اسلام کا جاہل دوست ہے، اور ایسے دوست سے زندیق اور دشمنان اسلام اچھے ہیں، چونکہ اولہ ہندسیہ، براہین فلسفیہ اور قواعد طبیعیہ بدیہیات میں سے ہیں اگر کوئی انسان یہ کہدے کہ دنیا منافی بدیہیات ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ خود اپنے دین کا بطلان کر رہا ہے، انسان کی پہلی تربیت دینی تربیت ہوتی ہے، لہذا اس وقت تک مسلمانوں کی اصلاح نہیں ہوسکتی جب تک ہمارے مذہبی پیشوا خود اپنی اصلاح نہ کرلیں، حقیقت پر جب نظر جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں جو تباہی پیدا ہوئی ہے پہلے یہ تباہی ہمارے علماء و روساء دین میں پیدا ہوئی، اور اس کے بعد تمام امت میں سرایت کر گئی۔

ادارۂ فروغ اردو (نقوش) لاہور کے مطبوعات

اور

اس کے خصوصی سالنامے

آپ ہم سے حاصل کرسکتے ہیں۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ جو کتابیں یا سالنامے مطلوب ہوں انکی قیمت ہمیں بھیج دیجئے پندرہ دن کے اندر ذریعہ رجسٹری آپ کو مل جائیں گی (وی، پی کے ذریعہ سے نہیں بھیجی جاسکتیں) آرڈر دس روپے سے کم کا نہ ہو اور محصول ڈاک بحساب ۱۵ فی صدی روانہ کیا جائے۔ **منیجر نگار** لکھنؤ

تاریخی و ادبی کتابیں

یہ بھی ۔۔ سید عابد علی عابد کے دلنشین ڈراموں کا مجموعہ ۵ر

سیاست الٰہیہ ۔۔ امام ابن تیمیہ کی تصنیف کا ترجمہ ۸ر

ہماری داستانیں ۔ ہماری قدیم داستانوں کی داستان ۵ر

نقوش لطیف ۔ مرتبہ احمد ندیم قاسمی ۔۔۔ ۷ر

مضامین جمال الدین افغانی ۔۔۔۔۔ ۵ر

انتقاد ۔۔ سید عابد علی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۳ر

پانچ ناولٹ ۔۔ مرتبہ وقار عظیم ۔ اس مجموعہ میں نٹو شوکت تھانوی، اشفاق احمد، اے حمید اور انصار حسین

کے بہترین ناولٹ ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ ۳ر

تذکرہ شعرائے متغزلین ۔۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ۸ر

امراؤ جان ادا ۔۔۔۔۔۔۔۔ للعہ

تصانیف شوکت تھانوی

مولانا ۔۔۔ ۳ر ـــ غزالہ ۔۔۔ ۳ر

بغدا نخواستہ ۔۔۔ ۳ر ـــ سودیشی ریل ۔ ۳ر

کتیا ۔۔۔۔۔ ۳ر ـــ سانچ کو آنچ ۔۔۔ ۳ر

کارٹون ۔ بے قاعدہ ۸ر ـــ بار خاطر ۔۔ للعہ

بقراط ۔۔۔۔۔ ۸ر ـــ جوڑ توڑ ۔۔۔ للعہ

مضامین شوکت ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶ر

قاضی جی (۳ حصے) فی حصہ ۔۔۔۔ ۳ر ۸ر

غالب کے ڈرامے ۔۔۔۔۔۔۔ ۶ر

وغیرہ وغیرہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲ر

نقوش کے چند خصوصی نمبر

افسانہ نمبر ۔ مجلد ۔۔۔۔۔۔ ۱۲ر

شخصیات نمبر ۲ ۔۔۔۔۔۔ ۱۰ر

نٹو نمبر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲ر

مکاتیب نمبر ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰ر

ایک فلسفی کا انجام

(والیٹر کا ایک افسانہ)

ایک دن ممنون کے دل میں آیا کہ "مجھ کو فلسفی ہونا چاہئے اور فلسفی بھی ایسا کہ ساری دُنیا میں میری شہرت ہو اور ہر شخص میری عزت کرے" پھر اس نے سوچا کہ یہ مقصود حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نفس کو برائیوں سے بچاؤں اور ایسے مشاغل سے احتراز کروں جو جذبات میں ہیجان پیدا کرتے ہیں۔ بے شک یہ بہت دشوار امر ہے لیکن اس کی اولین تدبیر یہ ہے کہ محبت سے دور رہوں اگر کوئی جمیل عورت نظر بھی آئے تو مجھے اپنے دل کو یوں سمجھانا چاہئے کہ" اس کے رخساروں کی تازگی و رونق بالکل فانی چیز ہے اور چند دن میں زایل ہو جائیگی اس کی خوبصورت آنکھوں کا جادو اور اس کے نگاہوں کی تڑپ عارضی ہے اور شباب زایل ہو جانے کے بعد ان میں سے کوئی کیفیت باقی نہ رہیگی اسی طرح اس کا بلوریں سینہ بھی ڈھل کر ایک نہ ایک دن بے معنی چیز ہو جائے گا، بال سفید ہو جائیں گے اور سر و ساق بھی جھک کر کمان ہو جائے گا، دوسری احتیاط یہ ہونی چاہئے کہ مسکر چیزوں سے پرہیز کروں، کیونکہ فقدان عقل، نقصان صحت اور تضیع اوقات کا بڑا سبب یہی مسکر اشیاء کا استعمال ہوا کرتا ہے، اسی کے ساتھ کھانے کے مسئلہ میں بھی یہ التزام ہونا چاہئے کہ صرف اسی قدر کھایا جائے جتنی ضرورت ہے کیونکہ کھانا زندگی کے لئے ہے نہ کہ زندگی کھانے کے لئے۔ اس کے علاوہ چونکہ میری ضروریات کم ہیں، اور دولت کافی ہے جو شاہی خزینہ دار کے پاس جمع ہے اس لئے میں استغناء کے ساتھ اپنی پوری زندگی بسر کر سکتا ہوں، نہ مجھے کسی حاکم کے پاس جانیکی ضرورت ہوگی، نہ میں کسی پر حسد کروں گا، نہ مجھ پر کوئی حسد کرے گا، خوش قسمتی سے بعض سچے دوست بھی مجھے مل گئے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ رشتۂ اُلفت قایم رہے، جب میں اُن کے افعال و حرکات پر کوئی تنقید ہی نہ کروں گا تو پھر کوئی جھگڑا ہی پیدا نہ ہوگا۔

جب ممنون اپنی کارگاہ خیال سے فارغ ہوا اور تمام تدبیریں منضبط ہو گئیں تو اس نے اپنے کمرہ کا دروازہ بند کیا اور دریچہ کے پاس کرسی ڈالکر نہایت اطمینان سے بیٹھ گیا، گویا اس نے ان تدبیروں پر عمل شروع کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس نے دریچہ سے دیکھا کہ دو عورتیں اس کے گھر کے سامنے سڑک پر جا رہی ہیں جن میں سے ایک بہت ضعیف ہے۔ لیکن اس کے چہرہ سے اطمینان ٹپک رہا ہے، دوسری بہت کمسن و جمیل ہے مگر اس کے بشرہ سے علامات قلق و اضطراب پیدا ہیں اور برابر رو رہی ہے اور جس قدر روتی جاتی ہے اس کا حُسن و جمال زیادہ دلکش ہوتا جاتا ہے۔

اس منظر کا ہمارے فیلسوف کے قلب پر بہت اثر ہوا لیکن یہ اثر اس کے حسن کی وجہ سے نہ تھا کیونکہ اس کا تو وہ عہد کر ہی چکا تھا صرف ہمدردی اس کا سبب تھا، یہ جلدی جلدی نیچے اُتر کے گیا اور اس سے گریہ و زاری کا سبب دریافت کیا۔ لڑکی نے نہایت دلچسپ پیرایہ میں اور ممکن تاثیر پیدا کرتے ہوئے اپنی داستان درد سنائی اور بولی کہ" میرے چچا نے میرا سارا سامان چھین لیا ہے اور میری ساری میراث سے مجھے محروم کر دیا ہے، اسی کے ساتھ وہ مجھے سخت جسمانی عذاب میں مبتلا کرتا ہے، حتیٰ کہ میں جان سے بیزار ہو گئی ہوں اور سوائے اس کے کوئی چارہ کار سمجھ میں نہیں آتا کہ خودکشی کر لوں۔ آپ بہت ذی فہم انسان معلوم ہوتے ہیں اگر تکلیف نہ ہو تو زحمت کر کے گھر تک چلئے اور میری سرگذشت تفصیل سے سنئے، ممکن ہے آپ میری مدد کر سکیں"

ممنون اس پر راضی ہو گیا اور کوئی وجہ راضی نہ ہونے کی نہ تھی، جب یہ گھر پہونچے تو ممنون کو وہ ایک نہایت آراستہ کمرہ میں لے گئی اور تخت پر بٹھا کر انتہائی حسن تاثیر کے ساتھ اپنا حال بیان کرنا شروع کیا، وہ روتی جاتی تھی اور حال بیان کرتی جاتی تھی اور اپنا سحر گفتگو

بھی پوری طرح صرف کر رہی تھی۔ ممنون نہایت غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا اس کی دلکش اداؤں کا مطالعہ کر رہا تھا اور نامعلوم طور پر دونوں میں فاصلہ مکانی کم ہوتا جاتا تھا۔ ٹھیک یہی وقت تھا کہ دفعتاً دروازہ کھول کر لڑکی کا چچا اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرہ سے انتہائی غیظ و غضب ٹپک رہا تھا۔ لڑکی تو دیکھ کر بھاگ گئی اور ممنون مبہوت و متحیر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ یہ موقعہ ایسا نہ تھا کہ ممنون اپنے فلسفہ کی مدد سے نجات حاصل کر سکتا، اس لئے مجبوراً اپنی جان و آبرو بچانے کے لئے جو کچھ اس کے پاس موجود تھا، لڑکی کے چچا کے حوالہ کر دینا پڑا۔ ممنون نہایت مجروح و شرمندہ حالت میں گھر واپس آکر پڑا ہوا تھا کہ اس کے بعض احباب کی طرف سے دعوت طعام کا رقعہ آیا اس نے اپنے جی میں کہا کہ "اگر میں گھر میں تنہا رہوں گا تو افکار کا اور زیادہ ہجوم ہوگا۔ کھانے کی بھی خواہش نہ ہوگی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ صحت پر خراب اثر پڑے گا، اس لئے چلنا ہی مناسب ہے ممکن ہے ان کی باتوں میں جی بہل جائے" چنانچہ وہ یہ سوچکر دعوت میں شریک ہوا اور وہاں احباب نے اس کے چہرے پر آثار ملال دیکھ کر شراب پینے پر اصرار کیا، ممنون نے دل میں سوچا کہ "تھوڑی سی شراب جس سے یہ ملال دور ہو جائے چنداں مضر نہیں ہو سکتی بلکہ مفید ہوگی" اس لئے اس نے اول اول چند جرعے پیئے اور پھر آہستہ آہستہ جب احساس کند ہونے لگا تو اور زیادہ پینے کی خواہش ہوئی یہاں تک کہ پورا نشہ اس پر مستولی ہوگیا۔ عشاء کے بعد جب دوستوں نے جوا کھیلنے کی ترغیب دی تو اس نے پھر یہ سوچ کر کہ "احباب کے ساتھ اس قسم کے مشاغل تفریحی برے نہیں ہوتے" جوا بھی کھیلا اور اس حد تک کہ جو کچھ اس کے پاس تھا وہ ہارا اور اس سے چہار چند کا قرض ہوگیا۔ اس کے بعد کسی بات میں نزاع پیدا ہوئی اور اس جھگڑے میں ایک شخص نے ایسی سخت ضرب اس کے چہرہ پر لگائی کہ ایک آنکھ پھوٹ گئی — اب یہ گھر واپس آیا لیکن اس حال میں کہ جو کچھ مال اس کے پاس تھا وہ ندارد ہو چکا تھا اور اس کا چوگنا قرض ہوگیا تھا اور ایک آنکھ بھی غائب ہو چکی تھی۔

دوسرے دن صبح کو اس نے اپنا خادم شاہی خزانچی کے پاس بھیجکر کچھ روپیہ طلب کیا تاکہ رات کا قرض ادا کرے لیکن خادم نے واپس آکر مطلع کیا کہ اس نے اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا ہے، اور اب ایک پیسہ بھی ملنے کی امید نہیں۔ یہ سن کر ممنون نے ایسا محسوس کیا جیسے اس پر بجلی گر گئی ہو وہ اٹھا اور آنکھ پر پٹی باندھ کر قصر شاہی کی طرف روانہ ہوا تاکہ اس سے فریاد کرے اور شاہی خزانچی کے مکر و فریب کا حال بیان کرے۔

قصر شاہی میں پہونچا تو یہاں بہت سی عورتیں امراء کی نظر آئیں جن میں سے بعض اس کو جانتی تھیں اور انھوں نے پوچھنا شروع کیا کہ "ممنون تمہاری آنکھ کیونکر جاتی رہی" اس سوال سے اس کا غصہ اور بڑھتا جا رہا تھا، لیکن مجبوراً خاموش رہا اور کسی نہ کسی طرح قصر شاہی کے قریب پہونچکر زمین بوس ہوا اور درخواست پیش کی۔ بادشاہ نے اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ درخواست لے لے اور مضمون سے اطلاع دے سکریٹری درخواست پڑھ کر ممنون کو علیحدہ لے گیا اور بولا کہ "تو مجھے کوئی بیوقوف مسخرا معلوم ہوتا ہے ورنہ بغیر میری وساطت کے درخواست براہ راست بادشاہ کے سامنے پیش کرنا کیا معنے رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ تو نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ کس شخص کی شکایت کر رہا ہے۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ میرا چچا زاد بھائی ہے اور میری حمایت اسے حاصل ہے۔ اس لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ اس دعوے کو بھلا دو اور ٹھنڈے ٹھنڈے گھر جاؤ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری دوسری آنکھ سلامت رہے"۔

ممنون نے عہد کیا تھا کہ وہ محبت نہ کرے گا، مسکرات سے احتراز کرے گا، جوا نہ کھیلے گا جو بنیاد ہے فساد کی اور امن و راحت کی زندگی بسر کرے گا، لیکن چوبیس گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ ایک ایک کر کے اس کے تمام عہد باطل ہوگئے اور وہ ایک بدترین انسان کی حیثیت سے اپنے مکان کی طرف واپس آیا۔ جب یہاں پہونچا تو معلوم ہوا کہ عدالت کے لوگ اس کے گھر کی چیزوں کو باہر نکال کر نیلام کر رہے ہیں اور ممنون کے احباب جن سے اس نے قمار بازی میں قرض لیا تھا وہاں موجود ہیں اور اپنے روپیہ کو اس طرح وصول کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس کو اس قدر سخت صدمہ ہوا کہ وہیں ایک درخت کے نیچے سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر میں اس خوبصورت لڑکی کو اپنے چچا کے ساتھ ادھر

ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ جب ان دونوں نے ممنون کو اس حال میں دیکھا تو قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔ غروب آفتاب کے بعد ممنون گھاس کے فرش پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا اور نہایت شدید تپ میں مبتلا ہو کر غافل سا ہو گیا۔ اس نے خواب میں ایک فرشتہ دیکھا جس کے نور سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں اور جس کے حسین پر تھے۔ ممنون نے اس سے دریافت کیا "تم کون ہو"

—— "تیرا محافظ فرشتہ"

—— "تو پھر مجھ پر رحم کرو اور میری کھوئی آنکھ، صحت، دولت، اور عقل واپس دلا دو"

—— "ہم اپنی دنیا میں ان حادثات سے دوچار نہیں ہوتے"

—— "اے متبرک روح تیرا قیام کہاں رہتا ہے"

—— "بہت دور، کرۂ آفتاب سے ایک ارب پچاس کروڑ میل کے فاصلہ پر، ایک نہایت چھوٹے سے ستارہ میں"

—— "کیسا مبارک ہے تمہارا وطن کہ نہ وہاں مکر و فریب میں مبتلا کرنے والی لڑکیاں ہیں، نہ جھوٹے دوست جو مال بھی چھین لیں اور آنکھ بھی پھوڑ دیں، نہ خائن لوگ ہیں کہ دیوالہ نکال کر دوسروں کا مال ہضم کر جائیں اور نہ ایسے حاکم جو عدل و انصاف طلب کرنے پر بُری طرح نکال دیں"

—— "خدا کا شکر ہے کہ یہ باتیں جن کا تم نے ذکر کیا ہے ہمارے ہاں نہیں ہیں۔ ہم عورت کی محبت کی طرف سے بھی محفوظ ہیں کیونکہ انکی آنکھوں میں ہمارے لئے کوئی اثر نہیں ہے، نہ کھانے پینے کی افراط ہو سکتی ہے کیونکہ ہم کھاتے پیتے ہی نہیں نہ ہمیں مفلس ہونے کا ڈر ہے کیونکہ وہاں سونے چاندی کا وجود نہیں، نہ آنکھوں کے جانے کا ڈر ہے کیونکہ ہمارے جسم ہی نہیں ہے اور نہ ظلم و جور کا اندیشہ ہے کیونکہ سب مساوی درجہ رکھتے ہیں"

—— "لیکن اے محترم فرشتے، آپ اپنا وقت کس طرح بسر کرتے ہوں گے جبکہ آپ عورت کی معاشرت اور کھانے پینے کی چیزوں سے محروم ہیں"

—— "ہمارا وقت ان لوگوں کی امداد میں بسر ہوتا ہے جو ہماری حفاظت میں دئے گئے ہیں۔ چنانچہ اس وقت میں تمہاری ہمدردی کے لئے آیا ہوں"

—— "افسوس، آپ کل کیوں نہ آئے کہ یہ مصائب مجھ پر نہ پڑتے"

—— "کل میں ایک تیرے دوسرے بھائی کی خدمت میں مشغول رہا جو شاہ ہندوستان کے پاس ملازم تھا اور وہ تجھ سے زیادہ مستحق اعانت تھا کیونکہ بادشاہ نے اس کی دونوں آنکھیں نکلوا لی ہیں اور ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے زنداں میں ڈال دیا ہے۔ بہرحال اب میں تمہاری ہی مدد کے لئے آیا ہوں۔ تمہاری آنکھ تو البتہ واپس نہیں مل سکتی، لیکن اور تکلیفیں رفتہ رفتہ ضرور زایل ہو جائیں گی۔ اگر تم نے پھر کبھی فلسفی بننے کا قصور نہ کیا"

—— "تو کیا فلسفی بننا اس قدر دشوار ہے؟"

—— "ہاں، یہ ایسا ہی دشوار ہے جیسے حکمت و قوت، قدرت و سعادت میں کمال حاصل کرنے کی خواہش۔ یہ تمام کُرے جو فضا میں نظر آتے ہیں اور جن کی تعداد لاکھوں تک پہونچتی ہے، یہاں ہر چیز تدریج کے ساتھ حاصل ہوتی ہے اور تم بھی اصلح و افضل تدریج ہی کے ساتھ ہو سکتے ہو"

یہ سن کر ممنون نے ایک سرد آہ کے ساتھ کہا کہ "ہاں ہوگا، لیکن میں تو اس وقت تک اس کی تصدیق نہیں کر سکتا، جب تک میری کھوئی ہوئی آنکھ نہ مل جائے"۔

مولانا ابوالکلام کی ایک پیش گوئی

(ڈاکٹر مولوی عبدالحق پر کیا گزری؟)

تقسیم ہند کے بعد جب دہلی میں قتل و غارتگری شروع ہوئی تو انجمن ترقی اردو کا کتب خانہ محض مولانا ابوالکلام کی وجہ سے بڑی حد تک محفوظ رہا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے یہاں کے حالات سے متاثر ہو کر پاکستان جانے کا فیصلہ کیا اور مولانا ابوالکلام سے مشورہ لیا۔ مولانا نے کہا کہ "آپ یہیں رہ کر اپنے کام میں مصروف رہئے۔ پاکستان میں آپ کو کبھی اطمینان سے کام نہ کرنے دیا جائے گا"۔ لیکن مولوی عبدالحق نے اس خیال سے کہ پاکستان میں ان کی زیادہ قدر افزائی ہوگی، مولانا آزاد کی اس پیش گوئی کو اہمیت نہیں دی اور کراچی چلے گئے لیکن اب دس سال کے بعد پتہ چلا کہ مولانا آزاد کی پیش گوئی کس قدر صحیح و درست تھی۔ اس سلسلہ میں ۴ مئی کا "لیل و نہار" ملاحظہ ہو۔ جس کے ایک مضمون کا اقتباس ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ (اڈیٹر)

خود ان کا ایک مکتوب "کم و بیش ڈیڑھ سال سے علمی ادبی کام معطل ہے۔ انجمن ایسے نااہل ہاتھوں میں جا پڑی ہے جن کو علم و ادب سے کچھ لگاؤ نہیں۔ البتہ جوڑ توڑ، سازش، تفرقہ پروری سے خاص دلچسپی ہے، انجمن کا روپیہ بے دردی سے ضایع کیا جا رہا ہے اور خلاف آئین انجمن نئی غیر ضروری آسامیاں قایم کر کے دوست نوازی کی خاطر ناکارہ لوگوں کا تقرر کیا جا رہا ہے۔ آپ پوچھیں گے یہ لوگ کون ہیں! یہ وہ حضرات ہیں جن کی بدعنوانیوں کو میں نے روکنا چاہا اور جن کے حالات و حسابات کی تنقیح کے لئے میں تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا اور جس کی رپورٹ باوجود مطالبے کے انھوں نے دبا رکھی ہے، اب وہ اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کے لئے انجمن میں تفرقہ اندازی کر رہے ہیں، ان صاحبوں نے اس عرصہ میں مجھے طرح طرح کی اذیتیں پہونچائیں اور ایسی عامیانہ اور چھچھوری حرکتیں کیں جو ناقابل برداشت حد کو پہونچ گئی ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ میرے ذاتی کتب خانے کو بھی مقفل کر کے سربمہر کر دیا ہے تاکہ جو کام میں اور میرے ساتھی اور دوسرے اصحاب کر رہے ہیں نہ کرنے پائیں ہمارے تمام مسودے (مکمل اور نامکمل) کتب خانے میں بند ہیں۔ یہ منصوبہ سوچ سمجھ کر اس ادعا کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ کہ ہم عبدالحق کو پے در پے اتنے "شاک" پہونچائیں گے کہ وہ دو تین مہینے میں ختم ہو جائے گا۔ پھر ہم اس کے کتب خانہ وغیرہ پر قبضہ کر لیں گے، جب انھوں نے یہ دیکھا کہ وہ یہ سب کچھ جھیل گیا اور مرنے کا نام نہیں لیتا تو انھوں نے اپنی اکثریت کے بل پر ترمیم دستور کی ایک قرارداد مجلس نظما میں منظور کر لی اور اس کو عمل میں لانے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس نے یہ قرارداد منظور کی کہ عبدالحق کو صدارت سے ہٹا کر سرپرستوں کی فہرست میں ڈال دیا جائے مطلب یہ کہ اسے انجمن سے کوئی واسطہ نہ رہے۔ یہ پہلا قدم ہے۔ دو ماہ کے بعد مجھے نوٹس دیا جائے گا کہ جن دو کمروں میں میرا قیام ہے وہ خالی کر دیجائیں کیونکہ انجمن کو ان کی ضرورت ہے۔ مجھے تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ میری کوئی املاک ہے نہ کوئی میرا گھر ہے، میں یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گا اس کا جواب مشکل نہیں۔ جب سرسید احمد خاں کو اس کے لائق فرزند نے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا اور اس نے ایک غیر شخص کے گھر میں جا کر انتقال کیا تو اگر یہ حضرات مجھے انجمن سے دھکے دے کر نکال دیں اور میں سول اسپتال کے فٹ پاتھ پر دم

ڑ دوں تو شکایت کا کیا موقع ہے۔

یہ ہے میری پنجاہ سالہ خدمات کا صلہ ——— پاکستان زندہ باد"

مولوی عبدالحق کو جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ جذبات کے آگے کم ہی سپر ڈالتے ہیں۔ لہٰذا جس عالم میں یہ سطور لکھی گئی ہوں گی س کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کام مولوی عبدالحق کی زندگی کی اساس ہے۔ وہ بے کار رہنا جانتے ہی نہیں۔ جب تک کتب خانہ لا تھا وہ برابر دن میں دس بارہ گھنٹے کام میں جٹے رہتے تھے۔ حریفوں کو معلوم تھا کہ کام اور کتب خانہ ان کا آخری حصار ہے ہٰذا جب کالج، پریس اور دفتر کے محاذوں پر فتحیاب ہو گئے تو کتب خانے کا رُخ کیا اور ایک روز اس پر یک طرفہ تالا چڑھا دیا۔ مولوی صاحب نے احتجاج کیا کہ آپ لوگوں کو اس کا حق نہیں۔ یہ میری کتابیں ہیں۔ میرے سارے مسودے بھی اسی میں ہیں۔ یہیں میں کام کرتا ہوں۔ طالب علم آکر ریسرچ کرتے ہیں۔ لیکن کون سنتا ہے۔ تالا چڑھے کوئی پانچ مہینے ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب دادرسی کے لئے کبھی کسی بڑے آدمی کے پاس جاتے ہیں۔ کبھی کسی کی مدد مانگتے ہیں لیکن با اثر حریفوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اس مہم کو سر کر کے انکے حریف بہت خوش ہیں۔ اگر کام بند ہوا۔ اگر مولوی عبدالحق ذہنی اذیت کا شکار ہیں۔ اگر طالب علم جن کے امتحان نزدیک ہیں، کتب خانہ بند دیکھ کر نراس ٹوٹ جاتے ہیں تو انھیں کیا فکر۔ ان کی قوت کا مظاہرہ تو ہو گیا کہ مولوی عبدالحق جن کو منانے کے لئے خود گاندھی جی اتنے جتن کرتے تھے، ان کے مقابلہ میں محض بے بس اور لاچار ہیں۔

حریفوں کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب کتابیں خرد برد کر رہے ہیں اور کتب خانہ دراصل انجمن کا ہے۔ اس بات پر ہنسی آتی ہے کیونکہ اصل پوزیشن سب کو معلوم ہے۔ کتب خانہ خاص، جس کا یہ سارا ذکر ہے، تین کتب خانوں پر مشتمل ہے۔ ایک کا نام ہے ذاتی کتب خانہ عبدالحق ——— اس میں وہ تمام نادر اور قیمتی کتابیں جمع ہیں جو مولوی صاحب نے ساری عمر کی محنت اور بیش قرار صرفے سے جمع کی ہیں اور جس کے لئے وہ سارے ہندوستان میں مارے مارے پھرے۔ اس کا بیشتر حصہ دہلی کے فسادات میں ضایع ہوا، لیکن اس کا مغز وہ وہاں سے نکال لائے تھے۔ دوسرا کتب خانہ محمد عمر الیافعی صاحب کا ہے جو مولوی صاحب کے پرانے دوست ہیں۔ ان کو پچاس ہزار روپے کی پیش کش ہوئی تھی لیکن انھوں نے بیچنے کی بجائے مولوی صاحب کی نذر کر دیا۔ یہ کہکر کہ مجھے انجمنوں وغیرہ کا بھروسہ نہیں آپ کو ذاتی طور پر سونپ رہا ہوں۔ ایک حصہ ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب کی عطا کردہ کتابوں کا ہے انھوں نے بھی واشگاف الفاظ میں یہ تحریر کر دیا تھا کہ یہ کتابیں انجمن کو ہرگز نہیں دی جا رہی ہیں۔ آپ کو دے رہا ہوں۔ ایک اور کتب خانہ جو کتب خانۂ عام کہلاتا ہے اور خاصا وسیع ہے۔ مولوی صاحب کے ایک نیاز مند مشیر حاتمی صاحب کی ملک تھا۔ وہ ہندوستان واپس چلے گئے اور تحریری طور پر مولوی صاحب کو یہ سونپ گئے۔ اتفاق کی بات ہے عمر الیافعی صاحب، ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب اور مشیر حاتمی صاحب ہر سہ حضرات نے یہ بات بالوضاحت لکھ دی کہ:-

۱- یہ کتب خانہ انجمن کو ہرگز نہیں دیا جا رہا ہے۔

۲- ذاتی طور پر آپ کی نذر ہے۔

اس وقت جبکہ اس قسم کے جھگڑے کا کوئی امکان نہ تھا۔ ان دستاویزات کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص کتب خانہ کی ملکیت میں شبہ کرے تو اسے سینہ زوری کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے۔ مولوی صاحب اپنا تصنیف و تالیف کا سارا کام کتب خانۂ خاص ہی میں کرتے تھے جو ان کے رہنے کے کمروں کے عین نیچے واقع ہے۔ طالب علم بھی وہیں آ بیٹھتے تھے۔ گرمیوں میں چوتھی منزل کی ٹین کی چھت تپ کر آگ ہو جاتی ہے لہٰذا شام تک کا وقت مولوی صاحب کتب خانہ ہی میں گزارتے تھے۔ مگر لوگوں کو اس پیرِ نود سالہ کی تکلیف اور اذیت کا اتنا بھی خیال نہیں۔

نادرات

عاقل وہ نہیں جو خیر و شر میں تمیز کر سکے بلکہ وہ ہے جو دو شر میں سے بہتر کا انتخاب کر سکے۔

غلام کے لئے صرف ایک آقا ہوتا ہے، لیکن طماع کے لئے ساری دنیا اسکی آقا ہی

دنیا کو عقل انسانی سے اتنا فایدہ حاصل نہیں ہوا جتنا نقصان پہونچا ہے۔

عورت کی کمر جتنی موٹی ہوتی جائے گی اسی قدر اس کا اعتقاد محبت ضعیف ہوتا جائے گا۔

قوی چھپاتا ہے اور کمزور ظاہر کرتا ہے۔

جو شخص سب سے محبت کرنے کا مدعی ہے وہ کسی سے محبت نہیں کرتا۔

عورت ایک بت ہے، مرد اس کی پرستش کرتا ہے لیکن پھر توڑ ڈالتا ہے۔

جو شخص اپنے وطن کی خدمت کرتا ہے وہ کسب سے بے نیاز ہوتا ہے

وہ شخص جو دوسرے کی خطا معاف نہیں کرتا، اس پل کو منہدم کرتا ہے جس پر سے وہ گزر رہا ہے

عورت کا امتحان کرو غصہ کے وقت، خوشی کے وقت نہیں۔

دولت پیدا ہوتی ہے مرد کے ذریعہ سے لیکن صرف ہوتی ہے عورت پر۔

انصاف مظلوم کے لئے جنت اور ظالم کے لئے دوزخ ہے۔

ایک عورت کے خاموش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے اس کا منہ چوم لیا جائے۔

عورت اپنے پاس کسی چیز کے کم ہونے کا افسوس نہیں کرتی بلکہ اس کو افسوس ہوتا ہے اس بات کا کہ دوسرے کے پاس کیوں زاید ہے۔

عورت کو کبھی نہ مارو خواہ وہ پھول ہی کیوں نہ ہو۔

جب سودا پسند آجاتا ہے تو خریدار اندھا ہو جاتا ہے۔

جس عورت کے جتنے بڑے بال ہیں اتنی ہی وہ کم عقل ہے۔

سات سال تک جستجو کرنے کے بعد کسی بات کی تصدیق کرو۔

عہد ٹیپو سلطان

کا

ایک نادر ذخیرہ مخطوطات اور وصلیوں کا

جو ہمارے ایک عزیز دوست کو وراثتاً پہونچا ہے، فروخت ہو رہا ہے۔ ان مخطوطات میں بعض عجیب و غریب نمونے خطاطی کے شامل ہیں، منجملہ ان کے ایک قرآن مجید ہے تین انچ سایز کا جو اپنی خطاطی و پاکیزگی کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتا، اور دو صفحات قرآن پاک کے ہرن کی کھال پر خط کوفی میں حضرت علی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں ـــــ ان کے علاوہ شاہنامہ، مثنوی مولانا روم اور دلایل الخیرات وغیرہ کے عجیب و غریب منقش مہذب و مطلا نسخے بھی اس ذخیرہ میں شامل ہیں اور وصلیوں کے نمونے تو اتنے اور ایسے موجود ہیں کہ شاید ہی اتنا ذخیرہ کہیں اور موجود ہو۔ کیٹلاگ طیار ہو رہا ہے۔ جو حضرات اس نوع کے مخطوطات اور خطاطی کے نادر نمونوں سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ ذیل کے پتہ پر خط و کتابت فرمائیں:۔ منیجر نگار لکھنؤ

فوراً فروخت ہوں گے

شاہنامہ فردوسی اور کلیات سعدی کے دو نہایت نادر مخطوطے مہذب و منقش اب سے سیکڑوں سال قبل کے لکھے ہوئے جو خطاطی و نقاشی کا بہترین نمونہ ہیں۔

قیمت:۔ شاہنامہ پانسو روپیہ ـــــ کلیات سعدی دو سو روپیہ ـــــ منیجر نگار لکھنؤ

آہ، ابوالکلام

ندیم جعفری)

کتنے ہی گل رات وقفِ گریۂ شبنم رہے
کتنے ہی دل شوق کے رازوں سے نامحرم رہے

گھٹ گیا دم ایک آہِ ناکشیدہ کے سبب
لب ہوئے بند ایک حرفِ ناشنیدہ کے سبب

چلتے چلتے رک گئے کس سوچ میں جادہ سپار
بن گیا آخر سوادِ شام منزل کا غبار

دفعتاً گل ہو گئے راتوں کی مجلس کے چراغ
فکر کی مشعل بھی ٹھنڈے ہوئے قلب و دماغ

ظلمتوں کی گود میں مچلے حسیں صبحوں کے خواب
دُور جا ڈوبا افق میں اک درخشاں آفتاب

اک مفسر، ایک عالم، اک مجاہد وقت کا
آج اس کہنہ سرا سے دفعتاً رخصت ہوا

پھر نہ برسے گا کبھی خوابوں میں بھی ابرِ بہار
رُو مقدر پر جہاں آباد کے محزوں دیار

اس طرح کھیلے گا اُٹھ کر سُرخ انگاروں سے کون
اور پکارے گا ہمیں مسجد کے میناروں سے کون

ارشد کاکوی)

کیا قیامت ہے بجھے خود نہ بجھائے دل کو
ایک ہی رنگ سے جلتا ہے چراغِ امید

پھول مرجھا کے شگفتہ بھی کہیں ہوتا ہے؟
کوئی کس دل سے کرے شوق کی اپنے تجدید

جیسے دروازۂ مفلس پہ صدائے سائل
یوں مرے دل کو جگاتی ہے ہر اک بار امید

رات بھر خواب میں ہنستے ہوئے دیکھا خود کو
جانے، کن تازہ بلاؤں کی بنے یہ تمہید

آج انھیں دیکھ کے ارشد کی مسرت مت پوچھ
جیسے زنداں میں اسیروں نے منائی ہو عید

آجکل

(حفیظ نعیمی)

ہر ہر نفس بہار بداماں ہے آج کل
ہر آرزو جوان و غزلخواں ہے آجکل

یہ عشق بے نوا کے مقدر کی تابشیں
اک شہر یار حسن کا مہماں ہے آجکل

خود زندگی ہے لغزش مستانہ اندنوں
پیر حرم بھی وقف خمستاں ہے آجکل

گلکاریٔ بہار ہے یا پرتوِ جمال،
ہر باغ و راغ شعلہ بداماں ہے آجکل

محتاج جام و بادہ و ساغر نہیں رہا
ساقی کی ہر نگاہ خمستاں ہے آجکل

اُس آفتاب حسن کی ذرہ نوازیاں!
ہر ذرہ آفتاب بداماں ہے آجکل

فریادِ ضبطِ شوق کہ یک شہرِ آرزو
بیتابیٔ نظر میں پرافشاں ہے آجکل

اللہ رے فریبِ محبت کہ دل کو پھر
سودائے استواریٔ پیماں ہے آجکل

کیا پھر کسی غریب کو دعوائے ہوش ہے
تزئینِ حسن تا حدِ امکاں ہے آجکل

کھو یا رہا ہے عقل کی وادی میں مدتوں
ذوقِ جنوں کہ سلسلہ جنباں ہے آجکل

جرمِ وفا و عشق کی اللہ یہ سزا!
اک تیرِ نیم کش بھی رگِ جاں ہے آجکل

کچھ حادثہ نہیں ہے جواں مرگیٔ حفیظ
پھر کیوں دلِ حضور پریشاں ہے آجکل

(ساحر بھوپالی)

اُتنی ہی بڑھتی گئی حسرت ترے دیدار کی
جس قدر حیرت حجابِ درمیاں بنتی گئی

اول اول داستاں پر تھا حقیقت کا گماں
آخر آخر ہر حقیقت داستاں بنتی گئی

گم نگاہی سے بھی پہلے تو لرز جاتا تھا دل
رفتہ رفتہ ہر جفا آرامِ جاں بنتی گئی

پہلے تو بس مجھ ہی تک تھیں درد کی سرگوشیاں
رفتہ رفتہ ساری دنیا رازداں بنتی گئی

مٹ کے ساحر خونِ دل سے جسکو میں لکھتا گیا
بس وہی روداد، رودادِ جہاں بنتی گئی

(شفقت کاظمی)

یہی کہ نیند نہ آئے گی پھر کسی کروٹ
کبھی وہ خواب میں آکر ملے تو کیا ہوگا

بہار آئی ہے سامان رنگ و بو لیکر
چمن میں پھول نہ پھر بھی کھلے تو کیا ہوگا

وہ شوقِ رسم و رہِ دوستی کہاں شفقت
بچھڑ کے پھر کوئی ہم سے ملے تو کیا ہوگا

دل میں پھر احساسِ غم تازہ ہوا
تجھ سے مل کر اور بھی صدمہ ہوا

حسرتِ دل خون ہو کر رہ گئی
یوں بھی وہ اکثر کرم فرما ہوا

اُن سے مل کر بھی نہ ہم کچھ کہہ سکے
بارہا اے کاظمی ایسا ہوا

(اکرم دھولیوی)

اے بے خودی نہ چھوڑ مرا ساتھ اب نہ چھوڑ
وہ جا چکے تو ہوش میں آنے سے فایدہ

جب تم یہ جانتے ہو کہ محفل ہے دم بخود
یوں بے نقاب سامنے آنے سے فایدہ

شوقِ فریب کار کا پردہ بھی اُٹھ گیا
اے دل اب ان کی بزم میں جانے سے فایدہ

جب وہ بھلا چکے تو کوئی بات ہی نہیں
اکرم اب اُن کو یاد دلانے سے فایدہ

(صبا جائسی)

وہی ہے شامِ غم مگر سکوں سا آپلا مجھے
نہ جانے کیا ہوا کہ اب وہ بے قراریاں نہیں

میں یادِ عہدِ اولیں بھلا کے مطمئن سا ہوں
خلوص ہی کے ساتھ ساتھ بدگمانیاں بھی تھیں

وہ جن کو نازِ ہوش تھا یہ حال ان کا ہوگیا
چلے جو تیری راہ میں نظر کہیں قدم کہیں

سکونِ دل کے واسطے فسانے کتنے اور تھے
مگر جو یاد کرنے دے صبا نگاہِ شرمگیں

کیا محبت میں یوں بھی ہوتا ہے؟
سامنے تم ہو آنکھ پُرنم ہے

(ہر شاعر کے مختصر سوانح)

(بچوں کے قومی غنوانات)

گلستانِ ہزار رنگ

مضمون وار منتخب اشعار کی نادر الوجود انسائکلوپیڈیا

مرتبہ

از حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رح

حضرت مولانا آزاد۔ "مجھے یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ سید بہاء الدین احمد صاحب نے ایک عرصہ کی محنت اور جستجو کے بعد ایک ایسا مجموعہ طیار کرنے کی کوشش کی ہے ... انھوں نے اُردو شاعری کے نظر و مطالعہ کی ایک نئی راہ کھولدی ہے۔ عنوانوں کے تجویز کرنے میں ہر طرح کے مواد و مطالب کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور اشعار کا انتخاب بھی سلیقے کے ساتھ کیا گیا ....."

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین ... "آپ کی محنت کا پھل سب کیلئے قابلِ قدر ہے ... میں آپ کو اس کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتا ہوں"۔

جناب رشید احمد صدیقی ... "میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک اس نوعیت کی جتنی کتابیں شایع ہوئی ہیں ان میں آپ کی کتاب سب سے بہتر ہے۔ مجموعہ ہر حیثیت سے قابلِ تعریف ہے ... اور آپ قابلِ تہنیت ..."

مولانا نیاز فتحپوری "نگار" میں ... "اس میں شک نہیں کہ یہ تالیف فاضل مصنف کے وسیع مطالعہ و حسنِ ذوق کی بڑی قیمتی دستاویز ہے ... دیباچہ کو اُردو ادب کی مختصر تاریخ کہنا غلط نہ ہوگا۔ یہ کتاب گویا تاریخ، تذکرہ اور انتخاب کا بڑا دلچسپ آمیزہ ہے جس کی ملک کو قدر کرنا چاہیئے"۔

ماہنامہ "آج کل" دہلی ... "ہمیں امید ہے کہ اہلِ ذوق اس ادبی تحفہ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور کوئی لائبریری اس سے خالی نہیں رہے گی"

ماہنامہ "صبا" حیدرآباد دکن ... "مجموعہ صحیح معنوں میں گلستانِ ہزار رنگ ہے .... کتب خانوں، شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والوں اور بطور خاص طلباء کے لئے ..... ایک قابلِ قدر تحفہ ہے ....."

قیمت مجلد دس روپئے، محصول ڈاک ذمہ ناشرین (نہایت نفیس کاغذ۔ بہترین کتابت و طباعت۔ بہت حسین جلد)

(یہ مجموعہ ہندی رسم الخط میں بھی شایع ہوا ہے جس کی تقریظ راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد اور وزیر اعلیٰ بہار نے لکھی ہے)

ملنے کا پتہ :- گیان منڈل پبلیکیشنز - دریاپور - پٹنہ - ۴ (بہار)